جلد ۷۵ | دسمبر ۱۹۷۰ء | عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

زرِ سالانہ : آٹھ روپے

فی پرچہ : ۵۰ پیسے

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے

زندگی پر اس کے ہمہ گیر اثرات سمجھنے کے لیے چند معیاری کُتب۔

اِسلامی نظامِ زندگی

سید ابوالاعلیٰ مودُودی

اسلام کے اخلاقی، سیاسی، معاشی

اور

معاشرتی تعلیمات کا جامع تعارف

اعلیٰ ایڈیشن - ۸/- روپے

سستا ایڈیشن - ۵/- روپے

اسلامی تہذیب اور اسکے اُصول و مبادی

سید ابوالاعلیٰ مودودی

اِسلامی

اور غیر اسلامی تہذیب کا فرق

زندگی کے بارے میں اِسلام کا صحیح نقطۂ نظر

اعلیٰ ایڈیشن : ۶/۵۰ روپے

سستا ایڈیشن : ۳/۷۵ روپے

نظامِ اسلامی مشاہیر اسلام کی نظر میں

مرتبہ

خلیل احمد حامدی

مراکش سے انڈونیشیا تک کے چوٹی کے

مسلم مفکرین کے مقالات

اسلام کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث

اعلیٰ ایڈیشن ۶/۵۰ روپے

اِسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳- ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

۱۶- بیت المکرم (پہلی منزل)، ڈھاکہ

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۴ | دسمبر ۱۹۷۰ء مطابق شوال المکرم ۱۳۹۰ ھجری | عدد ۴

مغربی پاکستان ـــــــــــ مشرقی پاکستان

چندہ سالانہ : آٹھ روپے ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور ہوائی ڈاک سے

فی پرچہ : ۸۰ پیسے ۵ ـ اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور فی پرچہ ۹۰ پیسے سالانہ ۱۰ روپے

ـــــــــــ عام ڈاک سے : ۸۰ پیسے : ۸ روپے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

پچھلے دنوں مشرقی پاکستان میں جو ہلاکت خیز طوفان آیا ہے اور اس سے جان و مال کا جو زبردست زیاں ہوا ہے، اُس کے تصور سے انسانی رُوح کانپ اٹھتی ہے۔ تندوتیز ہوا اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تلاطم نے گزشتہ دو صدیوں میں کہیں اتنی تباہی نہیں مچائی جتنی پاکستان کے مشرقی بازو میں اب دیکھنے میں آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر رحم فرماتے اور انہیں ارضی و سماوی آفات سے محفوظ رکھے۔ اسی کے کرم پر بندوں کی زندگی کا انحصار ہے، کیونکہ کائنات کا پورا انتظام اُسی قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ یہ تباہی اس نوعیت کی ہے کہ اس سے پوری انسانیت تڑپ اٹھی ہے اور دنیا کے قریب قریب ہر ملک نے اس سے متاثر ہونے والوں کی اعانت اور دستگیری کے لیے ہاتھ بڑھایا ہے۔ مگر یہ بربادی اس قدر زیادہ ہے کہ ان سب کی مجموعی پیش کش بھی صورت حال سے نمٹنے کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ اس سلسلے میں مسلمان حکومتوں کو غیر معمولی فیاضی کا ثبوت دینا چاہیے، کیونکہ یہی وہ مواقع ہیں جن میں دینی اخوت اور بھائی چارے کے جذبات کو پوری طرح بروئے کار آنا چاہیے۔ جہاں تک اہلِ پاکستان کا تعلق ہے یہ تو ان کے گھر کی بربادی ہے۔ اس لیے جو لوگ بھی اس کی زد سے محفوظ رہے ہیں، خواہ ان کا تعلق مغربی پاکستان سے ہے یا مشرقی پاکستان سے، انہیں اپنی سلامتی پر خدا کا شکر کرنا چاہیے اور اپنے ان تباہ حال بھائیوں کی بھرپور امداد کرنی چاہیے جو اس آفت کے شکار ہوئے ہیں۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ اگر خدانخواستہ یہ مصیبت ان پر ٹوٹ پڑتی تو ان کا کیا حشر ہوتا اور یہ دولت جس کی محبت میں وہ گرفتار ہیں ان کے کس کام آتی۔ اس قومی مصیبت کے وقت پاکستان کے ہر فرد

کو زیادہ سے زیادہ ایثار سے کام لینا چاہیے اور تعیّشات اور آسائشات کی قربانی تو ایک طرف اپنی ضروریات تک کو قربان کر کے اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی امداد کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔

ان حالات میں حکومت پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کام کی طرف سب سے زیادہ توجہ دے اور اگر اسے اپنے دوسرے کاموں یا منصوبوں کو وقتی طور پر نظر انداز بھی کرنا پڑے تو کر دے۔ یہ تباہی اور بربادی اس قدر زیادہ ہے کہ جب تک حکومت اس کام کی طرف پورے انہماک سے متوجہ نہ ہو گی اس وقت تک ستم زدہ افراد کی بحالی کا کام خاطر خواہ انداز سے سرانجام نہ دیا جا سکے گا۔ اس کام کے لیے مالی امداد کے علاوہ اس بات کی بھی اشد ضرورت ہے کہ معاونت و دستگیری کا یہ فرض ایسے کارندوں کے سپرد کیا جائے جو مستعد اور ایماندار ہونے کے علاوہ اپنے اندر افسریت کی خو بو نہ رکھتے ہوں بلکہ اپنے پہلو میں حساس اور دردمند دل رکھتے ہوں اور اس کام کو پوری احساسِ ذمہ داری اور دلسوزی کے ساتھ سرانجام دینے کے لیے تیار ہوں۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ایسے کارندے روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں مگر ان کا فقدان بھی نہیں ہے۔ اگر حکومت تھوڑی سی کوشش کرے تو اسے انسانیت کے بہی خواہ کارندوں کی اچھی خاصی تعداد مہیّا ہو سکتی ہے۔

اس سلسلے میں حکومت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ پوری سنجیدگی سے سیلاب کے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرے جو ہر سال بلکہ کبھی کبھی سال میں کئی بار مشرقی پاکستان کے باشندوں کے لیے تباہی و بربادی کا سامان بنتا ہے۔ اس مصیبت سے آخر نجات کی کوئی مؤثر صورت پیدا کرنی چاہیے۔

دنیوی تدابیر کے ساتھ ہم پاکستان کے باشندوں کو اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے جو پوری کائنات کا خالق، مالک اور حاکم ہے۔ کائنات کی کوئی چھوٹی بڑی چیز یا قوت ایسی نہیں جو براہِ راست اس کے قبضۂ قدرت میں نہ ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جلیل القدر صحابہؓ ہمیشہ اپنے خالق سے رحمت کی دعائیں مانگتے رہتے تھے اور جب بھی کائنات کے تیور ذرا بدلتے ہوئے دیکھتے یا مظاہرِ کائنات

میں کوئی غیر معمولی حرکت محسوس کرتے تو فوراً بارگاہِ ایزدی میں گڑگڑا کر دعائیں مانگتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں احادیث میں مذکور ہے کہ جب بھی فضا میں برق و باراں یا آندھی کے آثار آپ کو نظر آتے تو آپ کا رنگ متغیر ہو جاتا اور بڑے اضطراب کے عالم میں رحمتِ خداوندی کے طلبگار ہوتے اور اس کے عذاب سے پناہ مانگتے:

اَللّٰھُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُھْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَعَافِنَا قَبْلَ ذَالِكَ

جس طرح تعمیر کی متعدد صورتیں ہیں اسی طرح تخریب اور خلفشار کے بھی مختلف راستے ہیں بعض راستے تو بڑے صاف اور واضح ہیں اور ایک انجان آدمی بھی انہیں دیکھ کر ان خطرات کو فوراً بھانپ لیتا ہے جو ان راستوں پر چلنے سے اُسے پیش آسکتے ہیں۔ مگر تخریب کی بعض راہیں اتنی پُرپیچ ہیں کہ ان کے نشیب و فراز کو عوام آسانی سے نہیں سمجھ سکتے۔ وہ اپنی دانست میں فلاح و کامرانی کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں مگر درحقیقت وہ تباہی و بربادی کی طرف بڑھتے ہیں شیطان انسان کو فریب دینے اور اسے ناکام بنانے کے لیے جو گہری چالیں چلتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بعض انسانوں کو سب سے پہلے بعض کاموں کے بارے میں بھلائی کے بڑے سہانے خواب دکھاتا اور بڑی دلفریب اور خوش آئند امیدیں وابستہ کرواتا ہے مگر جب نتائج ان کی حسبِ منشا نہیں نکلتے تو انہیں مایوسی کا شکار کر دیتا ہے اور پھر اپنی اس فتح مندی پر بڑا خوش ہوتا ہے۔

شیطان تو خیر ہے ہی انسان کا ازلی دشمن۔ مگر افسوس کے قابل اُن لوگوں کی حالت ہے جو اس کے فریب میں آکر خواہ مخواہ کسی فرد یا گروہ یا کسی کام سے ایسی غلط قسم کی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں جن کے سو فیصد پورا ہونے کے دُور دُور تک امکانات نہیں ہوتے۔ اور پھر جب انہیں کسی حد تک ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو یاس و قنوطیت کا شکار ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور تعمیری اندازِ فکر کو چھوڑ کر منفی اندازِ فکر اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ خواہ کتنے مخلص ہوں مگر صحیح بات یہ ہے کہ یہ اندازِ فکر عملی زندگی کے لیے کسی طرح بھی

مفید نہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ انداز مایوس ہونے کے لیے ہی اختیار کیا جاتا ہے تو زیادہ صحیح ہو گا۔ اس کی مثالیں ہمیں معمولی افراد سے لے کر نامور شخصیات تک اور عام واقعات سے لے کر بڑے اونچے قومی مسائل تک میں بکثرت ملتی ہیں۔ مثلاً آپ زندگی میں ایک شخص سے تعلقات قائم کرتے ہیں اس شخص کی عام روش بڑی اچھی ہے۔ اس نے آپ کے ساتھ اکثر اوقات بھلائی کا معاملہ کیا ہے۔ مگر کبھی اس سے لغزش ہو جاتی ہے تو کیا آپ کا سوچنے کا یہ انداز صحیح کہا جا سکتا ہے کہ آپ اس کی ایک لغزش کو دیکھتے ہوئے نہ صرف اس سے بگاڑ پیدا کر لیں گے اور اس کے خلاف ایک مہم چلائیں بلکہ پوری انسانیت سے مایوس ہو کر بیٹھ جائیں اور انسان کے بارے میں یہ تصور اپنے ذہن میں راسخ کر لیں کہ آدمی نیک اور بھلا ہو سکتا ہی نہیں، درانحالیکہ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ جس چیز کو آپ لغزش سمجھ رہے ہیں وہ لغزش ہی نہ ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی نظر میں اس سے کوئی کوتاہی ایسی ہوئی ہے جس نے آپ کو مایوس کیا ہے، مگر اس میں ایک غلطی آپ کی بھی ہے جو کسی اعتبار سے کم سنگین نہیں کہ آپ نے اس شخص سے ایسی توقع وابستہ کر لی جس کے لیے آپ کے پاس کوئی جواز نہیں۔ آخر آپ نے یہ کیوں فرض کر لیا کہ بھلے آدمی سے بھولے سے بھی کوئی لغزش سرزد نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی شاعرانہ توقعات مایوسی کی آغوش میں پناہ لینے کے لیے ہی تو انسان پیدا کرتا ہے۔

مسلمان جو کبھی دنیا کے سب سے زیادہ حقیقت پسند انسان تھے آج بدقسمتی سے ہر مرحلے اور ہر گام پر ہر تحریک اور ہر فرد یا گروہ کے بارے میں توقعات کے اس قسم کے شاعرانہ طلسمات میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ وہ پہلے کسی فرد یا کام کے بارے میں خوابوں کے محل تعمیر کرتے ہیں مگر پھر معمولی دھچکے کے ساتھ فوراً ہی انہیں پیوندِ خاک کر دیتے ہیں اور اپنے اندازِ فکر کی کوتاہی پر غور کرنے اور آئندہ محتاط رہنے کے بجائے ان جھوٹی آرزوؤں اور تمناؤں کے مرقد بنا کر ان پر دھونی رما کر بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ گزشتہ سو سال کی تاریخ کا جائزہ لیں تو آپ کو اس قسم کی مایوسی کی کئی ایک مثالیں ملیں گی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جسے "غدر" کا نام دیا جاتا ہے مسلمانوں کو ناکامی ہوئی تو اس ناکامی کے اسباب پر غور کرنے

خود پاکستان کے حالات امریکہ اور روس کی اس ملی بھگت کی شہادت فراہم کرتے ہیں۔ ہمارے اس ملک میں ایک مدت تک امریکہ کا غیر معمولی اثر قائم رہا اور خارجی اور داخلی تعلقات میں ہم اس کا اشارہ ابروئے چشم پاکر ہی ہر قدم اٹھاتے رہے۔ اس کے افکار و نظریات اور اس کی تہذیب و تمدن کو ہم نے اپنے ہاں رواج دینے کی کوشش کی۔ مگر ساتھ ساتھ اشتراکی نظریات کو بھی بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے پورے مواقع فراہم کیے گئے اور اس معاملے میں بھی کسی قسم کی مزاحمت نہ کی گئی۔ امریکہ اور روس دونوں اس بات سے خوش تھے کہ اس ملک میں الحاد اور مادیت سرایت کرتی جارہی ہے اور اسلامی تعلیمات کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ جہاں تک مغربی اقدار کی ترویج و اشاعت کا تعلق ہے دونوں ایک دوسرے کے ہم عنان تھے، بلکہ بسا اوقات کھلے طور پر ایک دوسرے کی معاونت اور دستگیری بھی کرتے تھے۔ بہت سی ایسی ایجنسیاں، ادارے اور تنظیمیں جو ثقافت اور آرٹ کے نام پر اس ملک کی اخلاقی اساس کو برباد کرنے میں منہمک تھیں ان کی امریکہ اور روس دونوں طرف سے حوصلہ افزائی کی جاتی رہی۔ مگر جب سیاسی مصالح کے نقطۂ نظر سے امریکہ نے کھل کر بھارت کی حمایت شروع کی اور پاکستان سے منہ موڑ لیا تو روس نے ہمارے اردگرد ایسی جذباتی فضا پیدا کر دی جس کے تحت ہم اس کی طرف نجات دہندہ کی حیثیت سے دیکھنے پر مجبور ہوئے۔ پاک بھارت جنگ کے بعد معاہدۂ تاشقند میں جس طرح روس نے امریکہ کی خواہش کے عین مطابق پاکستان کو بعض ذلت آمیز شرائط پہ بھارت سے صلح کرنے پر مجبور کیا وہ ان دونوں ملکوں کی ملی بھگت کی کھلی شہادت ہے۔ جو کام امریکہ نہ کر سکتا تھا وہ اس نے روس کے ذریعے کروایا اور اس امر کی کوشش کی کہ ہم اب روس پر اعتماد کرنا شروع کر دیں تاکہ ان دونوں بتوں سے مایوس ہو کر کہیں یکسوئی کے ساتھ اپنے خدا کی طرف متوجہ نہ ہونے پائیں اور اپنی دنیا خود اپنی نظریاتی اور تہذیبی بنیاد پر تعمیر کرنے کا عزم نہ کریں۔

امریکہ اور روس کے درمیان ممکن ہے سامراجی عزائم کی تکمیل کے معاملے میں کچھ اختلافات ہوں اور مادی مفادات کی تقسیم کے سلسلے میں ان کے مابین کبھی کبھی تلخی اور رنجش پیدا بھی ہو جاتی ہو، مگر

اسلام کو مٹانے اور اس کے مقابلے میں غیر اسلامی نظریات اور اقدار کو قوت بہم پہنچانے اور اسلام کے علمبرداروں کی طاقت کو توڑنے کے معاملے میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔ مسلم ممالک میں احیائے اسلام کے لیے جو تحریکات کام کر رہی ہیں، یہ دونوں ممالک انہیں برباد کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں اور جب بھی انہیں کسی طرف سے زک پہنچائی جاتی ہے انہیں بےحد خوشی ہوتی ہے۔ اخوان المسلمین کی تباہی پہ امریکہ اور روس دونوں کو جس قدر خوشی اور مسرّت ہوئی وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

پاکستان کی جماعت اسلامی اور اس کے امیر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے خلاف آئے دن امریکی پریس، اور نام نہاد امریکی مصنفین جس قسم کا مواد پیش کرتے رہتے ہیں اُن سے اُن کے ناپاک عزائم کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انگلستان اور امریکہ میں پاکستان کے سیاسی معاشرتی اور معاشی حالات کے بارے میں متعدد کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں۔ لیکن ان سب میں جماعت اسلامی کے بارے میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ یہ چند تنگ نظر رجعت پسند اور دقیانوسی ملاؤں کی ایک فاشسٹ تنظیم ہے جو قوت کے بل بوتے پر معاذ اللہ ایک فرسودہ اور بیکار نظامِ حیات نافذ کرنا چاہتی ہے، اس کے ماننے والوں میں اندھے جوش کے سوا کوئی چیز نہیں، دقیانوسیت ان کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ اس معاملہ میں اگر کوئی شخص ان لوگوں کے خیالات کی چند جھلکیاں دیکھنا چاہتا ہے تو اسے FREELAND ABBOT اور BINDER کی تحریروں پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیے۔ اِن سے اسے ان کے رجحانات اور عزائم کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ یہ لوگ اسلام کے اُن سارے خادموں کے دشمن ہیں جو مسلمانوں کو دینِ حق کی دعوت دیتے ہیں اور انہیں اس بات پر سرگرمِ عمل کرتے ہیں کہ وہ اس دین کی اساس پر اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کریں اور پھر اس دین کو دنیا کی ایک غالب قوت بنانے کے لیے جدوجہد کریں۔ اوّل تو ان غیر مسلم قوموں کو اسلام کے نام ہی سے چڑ ہے۔ لیکن اگر وہ مسلم قوم کے مزاج کو سامنے رکھ کر اس کی کوئی صورت گوارا کرنے پر آمادگی کا اظہار بھی کرتی ہیں تو دین کی اس شکل کو برداشت نہیں کرتیں جس کا عملی نمونہ ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم یا آپ کے جلیل القدر صحابہ یا دوسرے صلحائے امت میں ملتا ہے بلکہ ان کے نزدیک اگر کوئی دین پسندیدہ ہے تو وہ جو مغربی تہذیب کا چربہ ہو اور جس میں اسلام کے نام پر مغربی تہذیب اور اس کی اقدار کو

کہ اس کے برسرِ اقتدار آنے سے اسلام کا تسلط قائم ہوگا یا غریب کی گٹھڑی بن جائیگی ایک ایسی سادگی ہے جس کے ڈانڈے حماقت اور بیوقوفی سے جاملتے ہیں۔ اس جماعت کی عملی روش کو دیکھتے ہوئے بھی اگر عوام کی آنکھیں نہ کھلیں اور وہ اس کے خوش کُن دعووں کے دامِ فریب میں گرفتار رہنا پسند کریں اور بعد میں جب نتائج ان لوگوں کی اِن خواہشات اور آرزوؤں کے بالکل برعکس برآمد ہوں تو پھر مایوسی کا شکار ہوکر بیٹھ جائیں تو اس میں قصور کسی اور کا نہیں بلکہ خود اُن کا اپنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اور غور و فکر کی جو صلاحیتیں عطا کی ہیں ان کا مقصد یہی ہے کہ انسان کے اندر حالات کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو اور وہ آنکھیں بند کر کے دنیا میں زندہ رہنے کے بجائے بصیرت کی آنکھیں کھول کر زندہ رہ سکیں۔ اگر انسان چند تنکوں سے ہوا کے رُخ کا اندازہ لگانے کی اہلیت رکھتا ہے تو وہ کسی فرد یا جماعت کے رویے سے اس کے عزائم کا آخر کیوں پتہ نہیں لگا سکتا؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان دلفریب خوابوں کی دنیا میں رہ کر لذّت محسوس کرتا ہے اور تلخ حقائق سے دوچار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتا ورنہ قدرت نے تو آنکھیں کھولنے کا قدم قدم پر سامان کر رکھا ہے۔ قدرت آگ سے پہلے فضا میں دھواں اٹھاتی ہے تاکہ آنے والے خطرے کو بھانپا جاسکے۔ اب اگر انسانوں کا کوئی گروہ دھوئیں کے بادل تو کیا آگ کے شعلوں کو دیکھ کر بھی حالات کی سنگینی سے غافل رہتا ہے تو اس غفلت کی سزا یہی ہے کہ وہ دنیا میں نامرادیوں کا شکار ہو کر رہے۔

یاس و قنوطیت کی ایک شکل تو وہ ہے جس میں انسان خود اپنی حماقت سے گرفتار ہوتا ہے۔ مگر چونکہ یہ ایک ایسا خوفناک مرض ہے جو کسی قوم کو اندر ہی اندر سے کھا جاتا ہے اس لیے دنیا کے چالاک اور عیار لوگ اکثر اوقات ایک منصوبے کے تحت اس کے جراثیم لوگوں کے دل و دماغ میں داخل کرتے ہیں۔ اس کی ایک صورت تو بالکل سیدھی سادھی ہے کہ جہاں بیٹھے اور جس جگہ گفتگو کا موقع ملا وہیں عوام کے اندر کسی بھلائی کے کام کے بارے میں مایوسی اور بددلی پھیلانے کی کوشش کی۔ آپ اگر معاشرے کے اندر چل پھر کر دیکھیں تو آپ کو اس طرح مسلمانوں کے ایمان کو نقب لگانیوالے کئی افراد ملیں گے۔ جب بھی اُن سے بات کیجیے وہ یہی کہتے سنائی

غریبوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ اگر اصحابِ اقتدار بدنیت نہ ہوتے تو وہ عزم اور تدبیر اور تھوڑی سی محنت کے ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کو مٹا کر اس کی جگہ اسلامی نظامِ معیشت کی تشکیل کر سکتے تھے۔ مگر حکومت کے اندر غیر دینی عناصر نے جان بوجھ کر ملکی معیشت کی تعمیر خالص سرمایہ دارانہ نظام کے مطابق کی، بلکہ یہاں سرمایہ داری کو ان سارے مفاسد کے ساتھ اُبھارا جن سے ایک لمبے تجربے کے بعد اب سرمایہ دارانہ ممالک پیچھا چھڑا چکے ہیں یا چھڑا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اس امر کا خاص طور پر اہتمام کیا کہ ملکی دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے، اور یہ ہاتھ اتنے مضبوط ہوں کہ پُورے ملک کو اپنی گرفت میں لے سکیں۔ پھر نوکر شاہی، سرمایہ داری اور جاگیرداری کے گٹھ جوڑ سے غریبوں کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کی کوشش کی گئی اور ہر گوشۂ حیات میں اس قدر لوٹ مچائی گئی کہ عوام کے لیے جینا دوبھر ہو گیا۔ اس کے بعد یہ تخیل پیش کرنا شروع کر دیا گیا کہ اصلاحِ حال کی کوئی صورت بجز اس کے ممکن نہیں کہ ملک کے سارے وسائلِ رزق براہِ راست حکومت کی تحویل میں دے دیے جائیں، عوام اس کے ہاتھ میں بے بس ہو جائیں اور حکومت لوگوں کو نپا تلا چارہ مہیا کرنے کا کوئی بندوبست کر دے۔ ان لوگوں نے جھوٹے پروپیگنڈے کے ذریعے بعض لوگوں کے ذہنوں کو اس قدر ماؤف کر دیا ہے کہ وہ یہ باور کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے کہ عوام آزادی اور عزت کے ساتھ بھی اپنی بنیادی ضروریات فراہم کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ اب مسلسل یہی تاثر دے رہے ہیں کہ زندگی کے نظام بس دو ہی ہیں۔ یا تو تم سرمایہ داری اور جاگیرداری کے استبداد کے تحت محرومیوں کے ساتھ فاقہ مستی کی زندگی بسر کرو، یا پھر ریاست کی خدائی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال کر غلامی کی زندگی اختیار کر لو۔ اشتراکیت کے اندر عوام کو معاشی اعتبار سے کس قدر آرام ملے گا یہ ایک الگ سوال ہے مگر ان لوگوں کی ہنر مندی دیکھیے کہ انہوں نے یہ فضا پیدا کر دی ہے کہ جو اشتراکیت کا مخالف ہے وہ لازمی طور پر عوامی مفاد کا دشمن، غریبوں اور ناداروں کا دشمن اور سرمایہ داری اور جاگیرداری کا حامی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اشتراکیت کے علاوہ جس نظام کی بھی حمایت کی جائے وہ لازمی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت اور غریب دشمنی ہی ہے۔

کے ادوارِ حکمرانی بھی دینی اور اخلاقی اعتبار سے اسلام کے اجتماعی نظام کی نہایت عمدہ مثالیں پیش کرتے ہیں۔

ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر وہ نظام جسے خالقِ کائنات نے بنایا ہے جس کے اصول و ضوابط کے صحیح ہونے پر خود انسان کی فطرت گواہی دیتی ہے جس کے درخشندہ نمونے تاریخ کے صفحات میں بکثرت موجود ہیں اور جس کی مثالی صورت ہر مسلمان کے دل و دماغ پر مرتسم ہے۔ اس کے بارے میں تو مایوسی کا اظہار کیا جاتا ہے اور جو نظام انسانی فطرت سے مطابقت بھی نہیں رکھتا جس کی تخلیق چند غیر متوازن ذہنوں نے کی ہے جو اپنی مثالی صورت میں ایک لمحہ کے لیے بھی عالمِ واقعات میں قائم نہیں ہوا اور جس کی تباہ کاریوں سے ایک دنیا واقف ہے اس سے خوش کن توقعات وابستہ کرکے اسے نافذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلامی نظام کے بارے میں یہ مایوسی بڑے ناپاک مقاصد اور مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے پھیلائی جاتی ہے۔

مسلم معاشرے میں مایوسی کی فضا پیدا کرنے کے لیے دوسری تکنیک یہ ہے کہ جو جماعتیں اسلام کی علمبردار ہیں یا جو افراد اسلام کی سربلندی کے لیے کوشاں ہیں ان کے خلاف بے سر و پا باتیں عوام میں مشہور کی جائیں اور اس معاملے میں اس قدر جھوٹ بولا جائے کہ عوام اسے سچ سمجھ کر قبول کرنے لگیں۔ مگر اس معاملے میں بھی عوام کو صحیح صورتِ حال پر غور کرنا چاہیے۔ ہم دعوے سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ "ملا" جسے آج پوری قوت سے ذلیل کیا جا رہا ہے بحیثیتِ مجموعی کفر کے علمبرداروں سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس بیچارے نے بے سر و سامانی کے ساتھ انگریزی استبداد کا مقابلہ کیا اور سخت غربت اور افلاس کے عالم میں دین کی شمع اس نے روشن رکھنے کی کوشش کی جب متاعِ دنیا کے یہ طلبگار انگریز کی خدمت و چاکری کرکے جاگیریں حاصل کر رہے تھے۔ ذرا حساب لگا کر دیکھیے کہ رشوت، غبن، خیانت، ظلم، بے انصافی، اقربا نوازی اور قومی مفاد سے غداری کا کتنا ارتکاب "ملا" کرتا ہے اور کتنا اس کو گالیاں دینے والے یہ روشن خیال ہمدردانِ قوم کرتے ہیں۔ قومی دولت کی لوٹ کھسوٹ "ملا" کرتا رہا ہے یا یہ مسٹروں کا کارنامہ ہے؟ سرمایہ دارانہ نظام "ملا" چلا رہا ہے یا مسٹر؟ قتل و غارت، ڈاکہ زنی، ہیرا پھیری اور دوسرے جرائم کو فروغ "ملا" کی سرپرستی میں ہو رہا ہے یا مسٹر کی؟ لیکن اسلام سے مسلمانوں کو بدظن اور مایوس کرنے کے لیے دیندار طبقے کے خلاف ایک مسلسل پروپیگنڈا ہے جو ہمارے ملک میں کیا جا رہا ہے، اور مقصد یہ ہے کہ جو طبقہ اب تک کی تمام خرابیوں کا اصل ذمہ دار ہے اس کے دامِ فریب میں لوگ ہمیشہ گرفتار رہیں۔

مایوسی پھیلانے کا تیسرا حربہ جو حقیقت میں گہری سازش ہے اور جس سے مسلمانوں کو پوری طرح چوکنا اور خبردار رہنا

چاہیے یہ ہے کہ اس انتخاب کے نتائج سے عوام کو بددل کیا جائے۔ اگر خدانخواستہ غیر اسلامی عناصر غالب آ جائیں تو پھر اسلامی قوتوں کو اس طرح دبا دیا جائے کہ وہ مستقبل میں اُٹھنے نہ پائیں، اور اگر وہ مغلوب ہو جائیں تو پھر اسمبلی کے باہر ایسی فضا پیدا کر دی جائے کہ یہ نمائندہ ادارہ اپنا کام بخوبی سرانجام نہ دے سکے۔ اس فتنے کے جو عمیر (؟) اسمبلی کے اندر جا سکیں وہ وہاں تعطل پیدا کریں اور قدم قدم پر رکاوٹیں ڈالیں اور باقی فتنہ پرداز باہر رہ کر عوام کو ہنگامہ آرائی پر آمادہ کر کے اسمبلی کے کام کو معطل کرنے کی کوشش کریں۔ اور اگر بالفرض اس میدان میں بھی خاطر خواہ کامیابی نہ ہو تو مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے اور ان کے مستقبل کو تاریک بنانے کے لیے تیسرا شیطانی حربہ یہ اختیار کیا جائے کہ انہیں اسمبلی سے بے جا توقعات وابستہ کرنے کی ترغیب دی جائے اور جب وہ ان کے حسبِ منشا پوری ہوتی نظر نہ آئیں تو اس "ناکامی" کو اسلامی نظام کی ناکامی کی دلیل کے طور پر پیش کر کے عوام کے اندر یہ گمراہ کن خیال پھیلایا جائے کہ اسلام نعوذ باللہ ناکام ہوا ہے۔ اس سازش سے ہمارے ملک کے ہر بہی خواہ کو پوری طرح واقف ہونا چاہیے۔ توقعات قائم کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ جو لوگ اس ملک میں دین کا کام کر رہے ہیں اُن سے یہاں کے عوام کو اچھی توقعات ہی رکھنی چاہئیں۔ مگر توقعات اور خوابوں کے محلات میں بہرحال ایک فرق ہے۔ توقعات ہمیشہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے وابستہ کرنا چاہئیں اور دیکھنا چاہیے کہ ان حالات میں کیا کام اور کتنا کام عملاً ممکن ہے۔

ہونے والے انتخابات کے نتائج کیا ہوں گے ان کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر اندازہ یہی ہے کہ اشتراکیت کے علمبردار اسمبلی میں اکثریت حاصل نہ کر سکیں گے۔ اسمبلی کے اندر اکثریت انشاء اللہ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے محافظوں کی ہو گی۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا محض ان لوگوں کے اسمبلی میں اکٹھا ہو جانے سے اسلامی نظام اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اس ملک میں برپا ہو سکے گا؟ اسلامی نظام کے قیام کے لیے صرف چند اسلام پسندوں کی اسمبلی کے اندر محض یکجائی کافی نہیں اس کے لیے چند ناگزیر شرائط بھی ہیں:

پہلی شرط تو یہ ہے کہ اسمبلی میں عظیم اکثریت ان لوگوں کی ہو جو محض اسلام کے نام لیوا نہ ہوں بلکہ فکر و عمل کے اعتبار سے واقعی مسلمان ہوں، اسلام کو جانتے بھی ہوں اور اس کے ساتھ گہری عقیدت اور وابستگی رکھتے ہوں، ان میں اتنی بصیرت ہو کہ موجودہ حالات میں اسلامی قوانین کا نفاذ حکمت کے ساتھ کر سکیں، اور ان کے درمیان پوری ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ حکومت کی مشینری میں ایسے مردانِ کار کی کافی تعداد موجود ہو جو اسلامی قوانین کے مطابق نظامِ حکومت چلانے کے خواہشمند بھی ہوں اور اس کی اہلیت بھی رکھتے ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو اور حکومت کی مشینری پر نظریات کے لحاظ سے بے دین اور کردار کے لحاظ سے بددیانت لوگوں کا قبضہ رہے تو محض اسمبلی کے اندر اسلامی قوانین کے نفاذ کا فیصلہ کر دینے سے وہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے جن کی جائز طور پر توقع کی جا سکتی ہے بلکہ اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ خود اسلامی قوانین کے بارے میں عوام کے اندر شکوک و شبہات پیدا ہونے شروع ہو جائیں۔

تیسری شرط یہ ہے کہ عوام کی اسلام سے وابستگی صرف نعرے بلند کرنے یا زیادہ سے زیادہ دیندار افراد کے حق میں ووٹ دینے تک ہی محدود نہ رہے بلکہ وہ فی الحقیقت اسلامی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کے دل وجان سے خواہشمند ہوں اور اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالنے کا سچا جذبہ رکھتے ہوں۔ اسلامی نظام کوئی عسکری بندیوں کا نظام نہیں ہے کہ وہ انسانوں کو ایک آہنی شکنجے میں کس کر رکھ دے۔ بیشک انسان کو ناجائز کاموں سے باز رکھنے کے لیے اسلام نے کچھ حدود و قیود مقرر کی ہیں مگر محض ان حدود و قیود کے بل بوتے پر اسلامی نظام کی ساری برکات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان حدود و قیود کا معاملہ تو دینی سرحدوں کا سا ہے جنہیں پھاندنے کی کسی صورت میں بھی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ مگر دین کا بیشتر حصہ تو ان سرحدوں کے اندر موجود ہے جس میں انسان اپنی دلی خواہش سے نیکی اور بھلائی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ عمل کے اس وسیع و عریض میدان میں اگر بے عملی کا مظاہرہ کیا جائے تو آخر مطلوبہ نتائج کس طرح برآمد ہو سکتے ہیں۔

ان واضح حقائق کو سامنے رکھ کر ہی قومی اسمبلی سے توقعات قائم کرنی چاہییں ورنہ یہاں کے عوام اسی مایوسی کے شکار ہوں گے جس کی آرزو بے دین طبقے مدت سے اپنے دلوں میں پال رہے ہیں۔ جو کچھ ان حالات میں ممکن ہے وہ یہی ہے کہ جمہوریت کی پٹڑی سے اُتری ہوئی گاڑی پھر پٹڑی پر چڑھ جائے۔ ملک میں ایک نمائندہ حکومت قائم ہو جائے جو عوام کے سامنے جوابدہ ہو۔ اسمبلی کے اندر اسلامی عناصر کے ایک مضبوط گروہ کی موجودگی کے باعث لے دینی کے اس سیلاب کی کسی حد تک روک تھام ہو جائے۔ ملک میں اسلام کے لیے فضا سازگار کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور عوام کو معاشی ظلم سے بچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ کیا جائے۔

تفہیم القرآن

اَلدَّہر

(۲)

یہ وہ لوگ ہیں جو (دنیا میں) نذر پوری کرتے ہیں۱۰، اور اُس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت

---

۱۰ نذر پوری کرنے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ آدمی پر واجب کیا گیا ہو اسے وہ پورا کرے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے خود اپنے اوپر واجب کر لیا ہو، یا بالفاظِ دیگر جس کام کے کرنے کا اس نے عہد کیا ہو، اسے وہ پورا کرے۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ آدمی پر واجب ہو، خواہ وہ اُس پر واجب کیا گیا ہو یا اس نے خود اپنے اوپر واجب کر لیا ہو، اسے وہ پورا کرے۔ اِن تینوں مفہومات میں سے زیادہ معروف مفہوم دوسرا ہے اور عام طور پر لفظ نذر سے وہی مراد لیا جاتا ہے۔ بہر حال یہاں اُن لوگوں کی تعریف یا تو اس لحاظ سے کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ واجبات کو پورا کرتے ہیں، یا اس لحاظ سے کی گئی ہے کہ وہ ایسے نیک لوگ ہیں کہ جو خیر اور بھلائی کے کام اللہ نے ان پر واجب نہیں کیے ہیں ان کو بھی انجام دینے کا جب وہ اللہ سے عہد کر لیتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں، کجا کہ اُن واجبات کو ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی کریں جو اللہ نے ان پر عائد فرمائے ہیں۔

جہاں تک نذر کے احکام کا تعلق ہے، اُن کو مختصر طور پر ہم تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۳۱۰ میں بیان کر چکے ہیں لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جائے تاکہ لوگ نذر کے معاملہ میں جو غلطیاں کرتے ہیں اور جو غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں ان سے بچ سکیں اور نذر کے صحیح قواعد سے واقف ہو جائیں۔

(۱) فقہاء نے نذر کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ ایک آدمی اللہ سے یہ عہد کرے کہ وہ اُس کی رضا کی

خاطر فلاں نیک کام کرے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ اس بات کی نذر مانے کہ اگر اللہ نے میری فلاں حاجت پوری کر دی تو میں شکرانے میں فلاں نیک کام کروں گا۔ ان دونوں قسم کی نذروں کو فقہاء کی اصطلاح میں نذر تبرر (نیکی کی نذر) کہتے ہیں اور اس پر اتفاق ہے کہ اسے پورا کرنا واجب ہے۔ تیسرے یہ کہ آدمی کسی ناجائز کام کے کرنے یا کسی واجب کام کے نہ کرنے کا عہد کرلے۔ چوتھے یہ کہ آدمی کوئی مباح کام کرنے تو اپنے اوپر لازم کرلے یا کوئی مستحب کام نہ کرنے کا یا کوئی خلافِ اولیٰ کام کرنے کا عہد کرلے۔ ان دونوں قسموں کی نذروں کو فقہاء کی اصطلاح میں نذر لجاج (جہالت اور جھگڑالوپن اور ضد کی نذر) کہتے ہیں۔ ان میں سے تیسری قسم کی نذر کے متعلق اتفاق ہے کہ وہ منعقد ہی نہیں ہوتی۔ اور چوتھی قسم کے متعلق فقہاء میں اختلاف ہے۔ بعض فقہا کہتے ہیں کہ اسے پورا کرنا چاہیے۔ بعض کہتے ہیں کہ قسم توڑنے کا کفارہ ادا کر دینا چاہیے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ آدمی کو اختیار ہے، خواہ نذر پوری کر دے، یا کفارہ ادا کر دے۔ شافعیوں اور مالکیوں کے نزدیک یہ نذر بھی سرے سے منعقد نہیں ہوتی۔ اور حنفیوں کے نزدیک دونوں قسموں کی نذروں پر کفارہ لازم آتا ہے۔ (عمدۃ القاری)۔

(۲) متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی نذر ماننے سے منع فرمایا ہے جو یہ سمجھتے ہوئے مانی جائے کہ اس سے تقدیر بدل جائے گی، یا جس میں کوئی نیک کام اللہ کی رضا کے لیے بطورِ شکر کرنے کے بجائے آدمی اللہ تعالیٰ کو بطورِ معاوضہ یہ پیشکش کرے کہ آپ میرا یہ کام کر دیں تو میں آپ کے لیے فلاں نیک کام کروں گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ اَخَذَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینھیٰ عن النذر ویقول انہ لا یردّ شیئاً وانما یُستخرج بہ من البخیل "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ نذر ماننے سے منع کرنے لگے اور فرمانے لگے کہ وہ کسی ہونے والی چیز کو پھیر نہیں سکتی، البتہ اس کے ذریعہ سے کچھ مال بخیل سے نکلوا لیا جاتا ہے" (مسلم۔ ابوداؤد)۔ حدیث کے آخری فقرے کا مطلب یہ ہے کہ بخیل یوں تو راہِ خدا میں مال نکالنے والا نہ تھا، نذر کے ذریعہ سے اس لالچ میں وہ کچھ خیرات کر دیتا ہے کہ شاید یہ معاوضہ قبول کرکے اللہ تعالیٰ اس کے لیے تقدیر بدل دے۔ دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا النذر لا یُقدِّم شیئاً ولا یُؤخِّرُہ وانما یُستخرج بہ من البخیل "نذر نہ کوئی کام پہلے کرا سکتی ہے، نہ کسی ہونے کام میں تاخیر کرا سکتی ہے۔ البتہ اس کے ذریعہ سے کچھ مال بخیل کے ہاتھ سے نکلوا لیا جاتا ہے" (بخاری و مسلم)۔ ایک اور روایت میں وہ کہتے

ہیں کہ حضورؐ نے نذر ماننے سے منع کیا اور فرمایا انه لا یاتی بخیر و انما یستخرج به من البخیل "اس سے کوئی کام بنتا نہیں ہے، البتہ اس کے ذریعہ سے کچھ مال بخیل سے نکلوا لیا جاتا ہے" (بخاری و مسلم)۔ تقریباً اسی مضمون کی متعدد روایات مُسلم نے حضرت ابو ہُریرہؓ سے نقل کی ہیں، اور ایک روایت بخاری و مسلم دونوں نے نقل کی ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا ان النذر لا یقرّب من ابن اٰدم شیئًا لم یکن اللہ قدرہ لہٗ ولٰکن النذر یوافق القدر فیخرج بذالك من البخیل ما لم یکن البخیل یرید ان یُخرج "درحقیقت نذر ابن آدم کو کوئی ایسی چیز نہیں دلواسکتی جو اللہ نے اس کے لیے مقدّر نہ فرمائی ہو، لیکن نذر ہوتی تقدیر کے مطابق ہی ہے کہ اس کے ذریعہ سے تقدیرِ الٰہی وہ چیز بخیل کے پاس سے نکال لاتی ہے جسے وہ کسی اور طرح نکالنے والا نہ تھا"۔ اِس مضمون پر مزید روشنی حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص کی اِس روایت سے پڑتی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا انما النذر ما ابتُغِیَ بہٖ وجہُ اللہ "اصل نذر تو وہ ہے جس سے اللہ کی خوشنودی مقصود ہو" (طحاوی)۔

(۳) نذر کے معاملہ میں ایک اور قاعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ بیان فرمایا ہے کہ صرف وہ نذر پُوری کرنی چاہیے جو اللہ کی اطاعت میں ہو۔ اللہ کی نافرمانی کرنے کی نذر ہرگز پوری نہیں کرنی چاہیے۔ اسی طرح ایسی چیز میں کوئی نذر نہیں ہے جس کا آدمی مالک نہ ہو، یا ایسے کام میں کوئی نذر نہیں ہے جو انسان کے بس میں نہ ہو۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا من نذر ان یطیع اللہ فلیطعہُ ومن نذر ان یعص اللہ فلا یعصِہٖ "جس نے یہ نذر مانی ہو کہ اللہ کی اطاعت کرے گا تو اسے اس کی اطاعت کرنی چاہیے، اور جس نے یہ نذر مانی ہو کہ اللہ کی نافرمانی کرے گا تو اسے نافرمانی نہیں کرنی چاہیے" (بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، طحاوی)۔ ثابت بن ضحاک کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: لا وفاء لنذرٍ فی معصیۃ اللہ ولا فیما لا یملك ابن اٰدم "اللہ کی نافرمانی میں کسی نذر کے پُورا کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، نہ کسی ایسی چیز میں جو آدمی کی ملکیت میں نہ ہو" (ابوداؤد)۔ مسلم نے اسی مضمون کی روایت حضرت عِمران بن حُصین سے نقل کی ہے۔ اور ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی

روایت اس سے زیادہ مفصل ہے جس میں وہ حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ لا نذر ولا یمین فی مالا یملک ابن اٰدم، ولا فی معصیۃ اللّٰہ، ولا فی قطیعۃ رحم "کوئی نذر اور کوئی قسم کسی ایسے کام میں نہیں ہے جو آدمی کے بس میں نہ ہو، یا اللہ کی نافرمانی میں ہو، یا قطع رحمی کے لیے ہو۔"

(۴) جس کام میں بجائے خود کوئی نیکی نہیں ہے اور آدمی نے خواہ مخواہ کسی فضول کام، یا ناقابلِ برداشت مشقت، یا محض تعذیبِ نفس کو نیکی سمجھ کر اپنے اوپر لازم کر لیا ہو اُس کی نذر پوری نہیں کرنی چاہیے۔ اس معاملہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بالکل واضح ہیں:

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورؐ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ آپ نے دیکھا ایک صاحب دھوپ میں کھڑے ہیں۔ آپ نے پوچھا یہ کون ہیں اور کیسے کھڑے ہیں؟ عرض کیا گیا یہ ابو اسرائیل ہیں، انہوں نے نذر مانی ہے کہ کھڑے رہیں گے، بیٹھیں گے نہیں، نہ سایہ کریں گے، نہ کسی سے بات کریں گے، اور روزہ رکھیں گے۔ اس پر آپ نے فرمایا مُرُوہ فلیتکلم ولیستظل ولیقعد، ولیتم صومہ "ان سے کہو بات کریں، سایہ میں آئیں، بیٹھیں، البتہ اپنا روزہ پورا کریں" (بخاری، ابوداؤد، ابن ماجہ، مُوطّا)۔

حضرت عُقبہ بن عامر جُہَنی کہتے ہیں کہ میری بہن نے ننگے پاؤں پیدل حج کرنے کی نذر مانی ہے اور یہ نذر بھی مانی ہے کہ اس سفر میں سر پر کپڑا بھی نہ ڈالیں گی۔ حضورؐ نے فرمایا اس سے کہو کہ سواری پر جائے اور سر ڈھانکے (ابوداؤد۔ مسلم نے اس مضمون کی متعدد روایات نقل کی ہیں جن میں کچھ لفظی اختلاف ہے)۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے عُقبہ بن عامر کی بہن کا یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے حضورؐ کے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں: اِنَّ اللّٰہَ لغنیٌّ عن نذرھا، مُرھا فلتَرکب "اللہ کو اس کی اِس نذر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے کہو کہ سواری پر جائے" (ابوداؤد)۔ ایک اور روایت میں حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا، میری بہن نے پیدل حج کرنے کی نذر مانی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ان اللّٰہ لا یصنع بشقاء اختک شیئاً، فلتحج راکبۃ "تیری بہن کے مشقت میں پڑنے کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں پڑی ہے۔ اسے سواری پر حج کرنا چاہیے" (ابوداؤد)۔

حضرت اَنس بن مالک کی روایت ہے کہ حضورؐ نے (غالباً سفرِ حج) میں دیکھا کہ ایک بڑے میاں کو

ان کے دو بیٹے سنبھالے لیے چل رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ عرض کیا گیا انہوں نے پیدل چلنے کی نذر مانی ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا ان اللّٰہ لغنیٌّ عن تعذیب ھٰذا نفسہٗ، و امرہٗ ان یرکب۔ "اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہے کہ یہ شخص اپنے نفس کو عذاب میں ڈالے" پھر آپ نے اسے حکم دیا کہ سوار ہو (بخاری، مسلم، ابوداؤد۔ مسلم میں اسی مضمون کی حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مروی ہے)۔

(۵) اگر کسی نذر کو پورا کرنا عملاً ممکن نہ ہو تو اسے کسی دوسری صورت میں پورا کیا جا سکتا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے روز ایک شخص نے اٹھ کر عرض کیا، یا رسول اللہ، میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ نے آپ کے ہاتھ پر فتح کر دیا تو میں بیت المقدس میں دو رکعت نماز پڑھوں گا۔ حضورؐ نے فرمایا یہیں پڑھ لے۔ اس نے پھر پوچھا۔ آپ نے پھر وہی جواب دیا۔ اس نے پھر پوچھا .. .. آپ نے فرمایا شانک اذاً "اچھا تو تیری مرضی"۔ دوسری ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا والذی بعث محمداً بالحق، لو صلّیت ھٰھنا لاجزأ عنک صلوٰۃ فی بیت المقدس "قسم ہے اُس ذات کی جس نے محمدؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اگر تو یہیں نماز پڑھ لے تو بیت المقدس میں نماز پڑھنے کے بدلے یہ تیرے لیے کافی ہوگی" (ابوداؤد)۔

(۶) اگر کسی نے اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں دے دینے کی نذر مان لی ہو تو اس کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اسے ایک تہائی مال دے دینا چاہیے، اور مالکیہ میں سے سحنون کا قول ہے کہ اسے اتنا مال دے دینا چاہیے جسے دینے کے بعد وہ تکلیف میں نہ پڑ جائے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ اگر یہ نذر تبرُّر کی نوعیت کی ہو تو اسے سارا مال دے دینا چاہیے، اور اگر یہ نذر لجاج ہو تو اسے اختیار ہے کہ نذر پوری کرے یا قسم کا کفارہ ادا کر دے۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اسے اپنا وہ سب مال دے دینا چاہیے جس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہو، لیکن جس مال میں زکوٰۃ نہیں ہے، مثلاً مکان یا ایسی ہی دوسری املاک، اس پر اس نذر کا اطلاق نہ ہوگا۔ حنفیہ میں سے امام زُفَر کا قول ہے کہ اپنے اہل و عیال کے لیے دو مہینے کا نفقہ رکھ کر باقی سب صدقہ کر دے (عمدۃ القاری۔ شرح مؤطا از شاہ ولی اللہ صاحب)۔

حدیث میں اس مسئلے کے متعلق جو روایات آئی ہیں وہ یہ ہیں: حضرت کعب بن مالک کہتے ہیں کہ غزوۂ

تبوک کے موقع پر میرے پیچھے رہ جانے کی وجہ سے جو عتاب میرے اوپر ہوا تھا اس کی جب معافی مل گئی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میری توبہ میں یہ بات بھی شامل تھی کہ میں اپنے سارے مال سے دست بردار ہو کر اسے اللہ اور رسول کی راہ میں صدقہ کر دوں گا۔ حضورؐ نے فرمایا نہیں ایسا نہ کرو۔ میں نے عرض کیا، پھر آدھا مال؟ فرمایا، نہیں۔ میں نے عرض کیا، پھر ایک تہائی؟ فرمایا ہاں (ابوداؤد)۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تم اپنا کچھ مال اپنے لیے روک رکھو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے (بخاری)۔ امام زہری کہتے ہیں کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت ابولبابہ نے (جن پر اسی غزوۂ تبوک کے معاملہ میں عتاب ہوا تھا) حضورؐ سے عرض کیا: میں اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں صدقہ کے طور پر اپنے سارے مال سے دست بردار ہوتا ہوں۔ حضورؐ نے جواب دیا تمہارے لیے اس میں سے صرف ایک تہائی دے دینا کافی ہے (مؤطا)۔

(۷) اسلام قبول کرنے سے پہلے اگر کسی شخص نے کسی نیک کام کی نذر مانی ہو تو کیا اسلام قبول کرنے کے بعد اسے پورا کیا جائے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ اس بارے میں یہ ہے کہ اسے پورا کیا جائے۔ بخاری، ابوداؤد اور طحاوی میں حضرت عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے زمانۂ جاہلیت میں نذر مانی تھی کہ ایک رات (اور بروایت بعض ایک دن) مسجد حرام میں اعتکاف کریں گے۔ اسلام لانے کے بعد انہوں نے حضورؐ سے فتویٰ پوچھا تو آپ نے فرمایا اَوْفِ بِنَذْرِكَ "اپنی نذر پوری کرو"۔ بعض فقہاء نے حضورؐ کے اس ارشاد کا یہ مطلب لیا ہے کہ ایسا کرنا واجب ہے اور بعض نے یہ مطلب لیا ہے کہ یہ مستحب ہے۔

(۸) میت کے ذمہ اگر کوئی نذر رہ گئی ہو تو اسے پورا کرنا وارثوں پر واجب ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام احمد، اسحاق بن راھویہ، ابوثور اور ظاہریہ کہتے ہیں کہ میت کے ذمہ اگر روزے یا نماز کی نذر رہ گئی ہو تو وارثوں پر اس کا ادا کرنا واجب ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ نذر اگر بدنی عبادت (نماز یا روزہ) کی ہو تو وارثوں پر اس کا پورا کرنا واجب نہیں ہے۔ اور اگر مالی عبادت کی ہو اور مرنے والے نے اپنے وارثوں کو اسے پورا کرنے کی وصیت نہ کی ہو تو اسے بھی پورا کرنا واجب نہیں، البتہ اگر اس نے وصیت کی ہو تو اس کے ترکے میں سے ایک تہائی کی حد تک نذر پوری کرنی واجب ہو گی۔ مالکیہ کا مذہب

بھی اس سے پتا چلتا ہے۔ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ نذر اگر غیر مالی عبادت کی ہو، یا مالی عبادت کی ہو اور میّت نے کوئی ترکہ نہ چھوڑا ہو، تو اسے پُورا کرنا وارثوں پر واجب نہیں ہے۔ اور اگر میّت نے ترکہ چھوڑا ہو تو وارثوں پر مالی عبادت کی نذر پُوری کرنا واجب ہے، خواہ اس نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو (شرح مُسلم للنّوَوی۔ بذل المجہود شرح ابی داؤد)۔ حدیث میں اس مسئلے کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عُبادہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے فتویٰ پوچھا کہ میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کے ذمہ ایک نذر تھی جو انہوں نے پُوری نہیں کی تھی۔ حضوؐر نے فرمایا کہ تم اس کی طرف سے پُوری کر دو (ابوداؤد، مُسلم)۔ دوسری روایت ابن عباس سے یہ ہے کہ ایک عورت نے بحری سفر کیا اور نذر مانی کہ اگر مَیں زندہ سلامت واپس گھر پہنچ گئی تو ایک مہینے کے روزے رکھوں گی۔ واپس آنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا اور وہ مر گئی۔ اس کی بہن یا بیٹی نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے مسئلہ پوچھا اور آپؐ نے فرمایا کہ اس کی طرف سے تُو روزے رکھ لے (ابوداؤد)۔ ایسی ہی ایک روایت ابوداؤد نے حضرت بُرَیدہ سے نقل کی ہے کہ ایک عورت نے حضوؐر سے اسی طرح کا مسئلہ پوچھا اور آپؐ نے اسے وہی جواب دیا جو اوپر مذکور ہُوا ہے۔ ان روایات میں چونکہ یہ بات صاف نہیں ہے کہ حضوؐر کے یہ ارشادات وجوب کے معنی میں تھے یا استحباب کے معنی میں، اور حضرت سعد بن عُبادہ کی والدہ کی نذر کے معاملہ میں یہ واضح نہیں ہے کہ وہ مالی عبادت کے بارے میں تھی یا بدنی عبادت کے بارے میں، اسی بنا پر فقہاء کے درمیان اس مسئلے میں اختلافات ہوتے ہیں۔

(۹) غلط اور ناجائز نوعیت کی نذر کے معاملہ میں یہ بات تو صاف ہے کہ اسے پُورا نہیں کرنا چاہیے البتہ اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ اس پر کفّارہ لازم آتا ہے یا نہیں۔ اِس مسئلے میں چونکہ روایات مختلف ہیں اس لیے فقہاء کے مسالک بھی مختلف ہیں۔ ایک قسم کی روایات میں یہ آیا ہے کہ حضوؐر نے ایسی صورت میں کفّارہ کا حکم دیا ہے۔ مثلاً، حضرت عائشہؓ کی یہ روایت کہ حضوؐر نے فرمایا لا نذر فی معصیۃ وکفارتُہٗ کفّارۃ یمین، "معصیت میں کوئی نذر نہیں ہے اور اس کا کفارہ قسم توڑنے کا کفارہ ہے" (ابوداؤد)۔ عُقبہ بن عامر جُہنی کی بہن کے معاملہ میں (جس کا ذکر اُوپر نمبر ۴ میں گزر چکا ہے) نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے حکم دیا کہ وہ اپنی نذر توڑ دیں اور تین دن کے روزے رکھیں (مسلم۔ ابوداؤد)۔ ایک اور عورت کے معاملہ میں بھی جس نے

ہر طرف پھیلی ہوئی ہو گی، اور اللہ کی محبت[11] میں مسکین اور یتیم اور قیدی[12] کو کھانا کھلاتے ہیں[13] اور

پیدل حج کی نذر مانی تھی، حضورؐ نے حکم دیا کہ وہ سواری پر حج کے لیے جائے اور قسم کا کفارہ ادا کرے (ابو داؤد)۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا من نذر نذرًا لم یسمّہ فکفارتہ کفارۃ یمین، ومن نذر نذرًا فی معصیۃ فکفارتہ کفارۃ یمین، ومن نذر نذرًا لا یطیقہ فکفارتہ کفارۃ یمین، ومن نذر نذرًا اطاقہ فلیف بہٖ "جس نے ایک نذر مان لی اور اس بات کا تعیّن نہ کیا کہ کس بات کی نذر مانی ہے وہ قسم کا کفارہ دے۔ اور جس نے معصیت کی نذر مانی وہ قسم کا کفارہ دے۔ اور جس نے ایسی نذر مانی جسے پورا کرنے کی وہ قدرت نہ رکھتا ہو وہ قسم کا کفارہ دے۔ اور جس نے ایسی نذر مانی جسے وہ پورا کر سکتا ہو وہ اسے پورا کرے" (ابو داؤد)۔ دوسری طرف وہ احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں کفارہ نہیں ہے۔ اوپر نمبر ۴ میں جن صاحب کا ذکر آیا ہے کہ انہوں نے دھوپ میں کھڑے رہنے اور کسی سے بات نہ کرنے کی نذر مانی تھی ان کا قصہ نقل کر کے امام مالکؒ نے مؤطا میں لکھا ہے کہ مجھے کسی ذریعہ سے بھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ حضورؐ نے ان کو نذر توڑنے کا حکم دینے کے ساتھ یہ بھی حکم دیا ہو کہ وہ کفّارہ ادا کریں۔ حضرت عبداللہ بن عَمْرو بن عاص کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من حلف علی یمین فرای غیرھا خیرًا منھا فلیدعھا ولیات الذی ھو خیر فان ترکھا کفارتھا "جس نے کسی بات کی قسم کھائی ہو اور بعد میں وہ دیکھے کہ اس سے بہتر بات دوسری ہے تو وہ اسے چھوڑ دے اور وہ کام کرے جو بہتر ہو اور اسے چھوڑ دینا ہی اس کا کفارہ ہے" (ابو داؤد۔ بیہقی کہتے ہیں کہ یہ حدیث اور حضرت ابو ہریرۃؓ کی یہ روایت کہ "جو کام بہتر ہے وہ کرے اور یہی اس کا کفارہ ہے" ثابت نہیں ہے)۔ امام نَوَوِی ان احادیث پر بحث کرتے ہوئے شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ، شافعی، ابو حنیفہ، داؤد ظاہری اور جمہور علماء کہتے ہیں کہ معصیت کی نذر باطل ہے اور اسے پورا نہ کرنے پر کفارہ لازم نہیں آتا۔ اور امام احمد کہتے ہیں کہ کفارہ لازم آتا ہے۔

[11] اصل الفاظ ہیں عَلٰی حُبِّہٖ۔ اکثر مفسّرین نے حُبِّہٖ کی ضمیر کا مرجع کھانے کو قرار دیا ہے، اور وہ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ کھانے کے محبوب اور دل پسند ہونے اور خود اُس کے حاجت مند

اُن سے کہتے ہیں کہ، ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں۔ ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ[۱۴]۔ ہمیں تو اپنے رب سے اُس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا

ہونے کے باوجود دوسروں کو کھلا دیتے ہیں۔ ابن عباس اور مجاہد کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے علیٰ حُبِّ الاِطعام یعنی غریبوں کو کھانا کھلانے کے شوق میں وہ ایسا کرتے ہیں۔ اور حضرت فُضَیل بن عیاض اور ابو سلیمان الدّارانی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں وہ یہ کام کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک بعد کا یہ فقرہ کہ اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْہِ اللّٰہِ (ہم تو اللہ کی خوشنودی کی خاطر تمہیں کھلا رہے ہیں) اسی معنی کی تائید کرتا ہے۔

۱۲؎ امام ابو یوسف کتاب الخراج میں لکھتے ہیں کہ قدیم زمانے میں دستور یہ تھا کہ قیدیوں کو ہتھکڑی اور بیڑیاں لگا کر روزانہ باہر نکالا جاتا تھا اور وہ سڑکوں پر یا محلوں میں بھیک مانگ کر پیٹ بھرتے تھے۔ بعد میں اسلامی حکومت نے یہ طریقہ بند کیا (صفحہ ۱۵۰ طبع ۱۳۸۲ھ)۔ اس آیت میں قیدی سے مراد ہر وہ شخص ہے جو قید میں ہو، خواہ کافر ہو یا مسلمان، خواہ جنگی قیدی ہو، یا کسی جُرم میں قید کیا گیا ہو، خواہ اسے قید کی حالت میں کھانا دیا جاتا ہو یا بھیک منگوائی جاتی ہو، ہر حالت میں ایک بے بس آدمی کو جو اپنی روزی کے لیے خود کوئی کوشش نہ کر سکتا ہو، کھانا کھلانا ایک بڑی نیکی کا کام ہے۔

۱۳؎ اگرچہ بجائے خود کسی غریب کو کھانا کھلانا بھی ایک بہت بڑی نیکی ہے، لیکن کسی حاجت مند کی دوسری حاجتیں پُوری کرنا بھی ویسی ہی نیکی ہے جیسی نیکی بھوکے کو کھانا کھلانا ہے۔ مثلاً کوئی کپڑے کا محتاج ہے، یا کوئی بیمار ہے اور علاج کا محتاج ہے، یا کوئی قرضدار ہے اور قرض خواہ اسے پریشان کر رہا ہے تو اس کی مدد کرنا کھانا کھلانے سے کم درجے کی نیکی نہیں ہے۔ اس لیے اس آیت میں نیکی کی ایک خاص صورت کو اس کی اہمیت کے لحاظ سے بطورِ مثال پیش کیا گیا ہے، ورنہ اصل مقصود حاجت مندوں کی مدد کرنا ہے۔

۱۴؎ ضروری نہیں ہے کہ غریب کو کھانا کھلاتے ہوئے وہ زبان ہی سے یہ کہیں۔ دل میں بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے اور اللہ کے ہاں اس کی بھی وہی حیثیت ہے جو زبان سے کہنے کی ہے۔ لیکن زبان سے یہ بات کہنے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ جس کی مدد کی جائے اس کو یہ اطمینان دلا دیا جائے کہ ہم اس سے کسی قسم کا شکریہ یا بدلہ نہیں چاہتے، تاکہ وہ بے فکر ہو کر کھائے۔

انتہائی طویل دن ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ انہیں اُس دن کے شر سے بچا لے گا اور انہیں تازگی اور سُرور بخشے گا[۱۵] اور ان کے صبر کے بدلے میں[۱۶] انہیں جنّت اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔ وہاں وہ اونچی مسندوں پر تکیے

---

[۱۵] یعنی چہروں کی تازگی اور دل کا سرور۔ دوسرے الفاظ میں روزِ قیامت کی ساری سختیاں اور ہولناکیاں صرف کفار و مجرمین کے لیے ہونگی، نیک لوگ اس دن ہر تکلیف سے محفوظ اور نہایت خوش و خرم ہونگے یہی بات سُورۂ انبیاء میں بیان کی گئی ہے کہ "وہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت ان کو ذرا پریشان نہ کرے گا اور ملائکہ بڑھ کر ان کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا" (آیت ۱۰۳)۔ اور اسی کی صراحت سورۂ نمل میں کی گئی ہے کہ "جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اُسے اُس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا اور ایسے لوگ اُس دن کے ہَول سے محفوظ ہوں گے" (آیت ۸۹)۔

[۱۶] یہاں صبر بڑے وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے، بلکہ درحقیقت صالح اہلِ ایمان کی پُوری دنیوی زندگی ہی کو صبر کی زندگی قرار دیا گیا ہے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد یا ایمان لانے کے بعد سے مرتے دم تک کسی شخص کا اپنی ناجائز خواہشوں کو دبانا، اللہ کی باندھی ہوئی حدوں کی پابندی کرنا، اللہ کے عائد کیے ہوئے فرائض کو بجالانا، اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنا وقت، اپنا مال، اپنی محنتیں، اپنی قوتیں اور قابلیتیں حتیٰ کہ ضرورت پڑنے پر اپنی جان تک قربان کر دینا، ہر اُس لالچ اور ترغیب کو ٹھکرا دینا جو اللہ کی راہ سے ہٹانے کے لیے سامنے آئے، ہر اُس خطرے اور تکلیف کو برداشت کر لینا جو راہِ راست پر چلنے میں پیش آئے، ہر اُس فائدے اور لذت سے دست بردار ہو جانا جو حرام طریقوں سے حاصل ہو، ہر اُس نقصان اور رنج و اذیت کو انگیز کر جانا جو حق پرستی کی وجہ سے پہنچے، اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اِس وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے کرنا کہ اِس نیک رویّے کے ثمرات اِس دنیا میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ملیں گے، ایک ایسا طرزِ عمل ہے جو مومن کی پوری زندگی کو صبر کی زندگی بنا دیتا ہے۔ یہ ہر وقت کا صبر ہے، دائمی صبر ہے، ہمہ گیر صبر ہے اور عمر بھر کا صبر ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۶۰۔ آلِ عمران، حواشی ۱۳، ۱۰۷، ۱۳۱۔ الانعام، حاشیہ ۲۳۔ جلد دوم، الانفال، حواشی ۳۷، ۴۷۔ یونس، حاشیہ ۹۰۔ ہود، حاشیہ ۱۱۔ الرعد، حاشیہ ۳۹۔ النحل، حاشیہ ۹۸۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۴۰۔ الفرقان، حاشیہ ۹۴۔ القصص، حواشی ۷۵، ۱۰۰۔ العنکبوت، حاشیہ ۹۷۔

حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت

ملک غلام علی صاحب

(۹)

بحث سابق میں یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین میں سے کسی بزرگ نے بھی اپنے کسی عزیز یا قرابت دار کے حق میں جانشینی کی تجویز امت کے لیے پیش نہیں فرمائی۔ یہ بات بھی صاف کی جاچکی ہے کہ عبادات و تقربات، یا پھر وہ معاملات جو مشروع طریق پر سرانجام پائیں، ان میں تو نیت کے وجود و فقدان اور نیت کی صحت و عدمِ صحت کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے، لیکن جو امور تعبّدی نہیں ہیں اور جن کا مشروع و مسنون ہونا ثابت نہیں، ان میں نیت کے غلط یا صحیح ہونے سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا۔ ان میں خواہ صحیح جذبہ یا نیت کارفرما ہو یا نہ ہو اور خواہ وہ ذاتی مفاد کے لیے ہوں یا قومی مفاد کے لیے، ان سے اختلاف کرنے یا انہیں غلط قرار دینے کا حق کسی طرح سلب نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کے افعال پر امت کے علماء و صلحاء ہمیشہ گرفت کرتے چلے آتے ہیں اور ضمناً ان کے جذبات و محرکات بھی زیر بحث آتے رہے ہیں۔ اس چیز کو نیت پر حملہ یا سوئے ظن کا نام دے کر اسے مذموم یا ممنوع قرار دینا درست نہیں۔ نیت پر حملہ اس صورت میں ہوتا ہے جب کسی عبادت یا نیکی کے کام کو بھی بلاوجہ بُری نیت پر مبنی سمجھ لیا جائے، ورنہ غلط کام بہرحال غلط ہے قطع نظر اس سے کہ وہ اچھے جذبے یا اچھی نیت سے کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

یزید کی ولی عہدی کے متعلق عثمانی صاحب کا بدلتا ہوا موقف اب یزید کی ولی عہدی کے متعلق مدیر البلاغ فرماتے ہیں کہ "جہاں تک اس مسئلے کا تعلق ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یزید کو ولی عہد بنانا رائے، تدبیر اور نتائج کے اعتبار سے صحیح تھا یا غلط، اس میں ہمیں مولانا مودودی صاحب سے اختلاف نہیں ہے۔ جمہور امت کے محقق علماء

ہمیشہ یہ کہتے آئے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فعل رائے اور تدبیر کے درجے میں نفس الامری طور پر درست ثابت نہیں ہوا اور اس کی وجہ سے امت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچا" بہ ہماں اتنی بات تو ان کے نزدیک بھی مسلّم ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یہ فعل رائے، تدبیر اور نتائج کے اعتبار سے صحیح نہ تھا اور امت کے اجتماعی مفادات کے منافی تھا۔

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ "مولانا سے ہمارا اختلاف اس مسئلے میں ہے کہ مولانا نے اس اقدام کو محض رائے اور تدبیر کے اعتبار سے غلط قرار دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ براہِ راست حضرت معاویہؓ کی نیت پر تہمت لگا کر اس بات پر اصرار فرمایا ہے کہ ان کے پیشِ نظر بس اپنا ذاتی مفاد تھا اور اس پر انہوں نے پوری امت کو قربان کر دیا" مدیر موصوف کے اس دوسرے معارضے کا جواب میں اب تک کی بحث میں دے چکا ہوں۔ میرے لیے دوبارہ بس اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اگرچہ مولانا نے نیت پر تہمت نہیں لگائی لیکن یہ امر جب تسلیم شدہ ہے کہ امیر معاویہؓ کا فعل رائے، تدبیر اور نتائج تینوں لحاظ سے غلط تھا اور مصالح اجتماعیہ کے حق میں نقصان رساں ثابت ہوا تو پھر جذبے یا نیت کے صحیح ہونے نہ ہونے یا ذاتی مفاد پر مبنی ہونے نہ ہونے سے عملاً کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ پھر مولانا مودودی نے جو بات کہی تھی وہ دراصل یہ تھی کہ "انہوں نے اس بات سے قطع نظر کر لیا کہ وہ اس طرح امت محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں" ان الفاظ کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ انہوں نے جانتے بوجھتے امت کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان کر دیا، بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ اس فعل کے نتیجے میں امت خلافت کے بجائے ملوکیت و آمریت اور نسلی بادشاہت کی راہ پر پڑ گئی اور یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار ممکن ہی نہیں ہے۔ کیا آپ خود جمہور محققین کا قول یہی بیان نہیں فرما رہے کہ یہ فعل درست نہ تھا بلکہ نقصان دہ ثابت ہوا؟

اس کے بعد عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ "ہماری آئندہ گفتگو کا حاصل یہ نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یہ اقدام واقعے کے اعتبار سے سو فی صد درست اور نفس الامر میں بالکل صحیح تھا یا انہوں نے جو کچھ کیا وہ بالکل ٹھیک کیا" ان الفاظ سے بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا عثمانی نے اپنے سابق موقف میں ترمیم کر کے اب یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہ اقدام صد فی صد درست یا بالکل ٹھیک نہیں، حالانکہ وہ پہلے اسے بلا تخصیص اور

ع ۱

تمہاری کارگزاری قابلِ قدر ٹھیری ہے[۲۶] ع

موجود ہوں گی۔ دوسرے یہ کہ سونے اور چاندی کے کنگن وہ بیک وقت پہنیں گے، کیونکہ دونوں کو ملا دینے سے حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ جس کا جی چاہے گا سونے کے کنگن پہنے گا اور جو چاہے گا چاندی کے کنگن استعمال کرے گا۔ رہا یہ سوال کہ زیور تو عورتیں پہنتی ہیں، مردوں کو زیور پہنانے کا کیا موقع ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قدیم زمانے میں بادشاہوں اور رئیسوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہاتھوں اور گلے اور سر کے تاجوں میں طرح طرح کے زیورات استعمال کرتے تھے، بلکہ ہمارے زمانے میں برطانوی ہند کے راجاؤں اور نوابوں تک میں یہ دستور رائج رہا ہے۔ سورۂ زُخرُف میں بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ جب اپنے سادہ لباس میں بس ایک لاٹھی لیے ہوئے فرعون کے دربار میں پہنچے اور اس سے کہا کہ میں اللہ رب العالمین کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں تو اس نے اپنے درباریوں سے کہا کہ یہ اچھا سفیر ہے جو اس حالت میں میرے سامنے آیا ہے، فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ (آیت ۵۳)۔ یعنی اگر یہ زمین و آسمان کے بادشاہ کی طرف سے بھیجا گیا ہوتا تو کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے؟ یا ملائکہ کا کوئی لشکر ہی اس کی اردلی میں آتا۔"

۲۵ پہلے دو شرابوں کا ذکر گزر چکا ہے۔ ایک وہ جس میں آبِ چشمۂ کافور کی آمیزش ہوگی۔ دوسری وہ جس میں آبِ چشمۂ زنجبیل کی آمیزش ہوگی۔ ان دونوں شرابوں کے بعد اب پھر ایک شراب کا ذکر کرنا اور یہ فرمانا کہ ان کا رب انہیں نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا، یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ کوئی اور بہترین نوعیت کی شراب ہوگی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضلِ خاص کے طور پر انہیں پلائی جائے گی۔

۲۶ اصل الفاظ ہیں کَانَ سَعْیُكُمْ مَّشْكُوْرًا۔ یعنی تمہاری سعی مشکور ہوئی۔ سعی سے مراد وہ پورا کارنامۂ حیات ہے جو بندے نے دنیا میں انجام دیا۔ جن کاموں میں اس نے اپنی محنتیں اور جن مقاصد کے لیے اس نے اپنی کوششیں صرف کیں ان سب کا مجموعہ اس کی سعی ہے اور اس کے مشکور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ قابلِ قدر قرار پائی۔ شکر جب بندے کی طرف سے خدا کے لیے ہو تو اس سے مراد اس کی نعمتوں پر احسان مندی ہوتی ہے، اور جب خدا کی طرف سے بندے کے لیے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی خدمات

اَے نبی، ہم نے ہی تم پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے[۲۷]، لہٰذا تم اپنے ربّ کے حکم پر صبر کرو[۲۸] اور اِن میں سے کسی بدعمل یا منکرِ حق کی بات نہ مانو[۲۹]۔ اپنے ربّ کا نام صبح و شام یاد کرو، رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو، اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو[۳۰]۔

کی قدر فرمائی۔ آقا کی یہ بہت بڑی عنایت ہے کہ بندہ جب اس کی مرضی کے مطابق اپنا فرض انجام دے تو وہ اس کا شکریہ ادا کرے۔

[۲۷] یہاں مخاطب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں، لیکن دراصل رُوئے سخن کفار کی طرف ہے۔ کفارِ مکہ کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم یہ قرآن خود سوچ سوچ کر بنا رہے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فرمان آتا تو اکٹھا ایک ہی مرتبہ آجاتا۔ قرآن مجید میں بعض مقامات پر اُن کا یہ اعتراض نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے، (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حواشی ۱۰۲-۱۰۴-۱۰۵-۱۰۶۔ بنی اسرائیل ۱۱۹)، اور یہاں اسے نقل کیے بغیر اللہ تعالیٰ نے پورے زور کے ساتھ فرمایا ہے کہ اِس کے نازل کرنے والے ہم ہیں، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اِس کے مصنّف نہیں ہیں، اور ہم ہی اس کو بتدریج نازل کر رہے ہیں یعنی یہ ہماری حکمت کا تقاضا ہے کہ اپنا پیغام بیک وقت ایک کتاب کی شکل میں نازل نہ کر دیں۔ بلکہ اسے تھوڑا تھوڑا کر کے بھیجیں۔

[۲۸] یعنی تمہارے ربّ نے جس کارِ عظیم پر تمہیں مامور کیا ہے اس کی سختیوں اور مشکلات پر صبر کرو، جو کچھ بھی تم پر گزر جائے اسے پامردی کے ساتھ برداشت کرتے چلے جاؤ اور پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دو۔

[۲۹] یعنی ان میں سے کسی سے دب کر دینِ حق کی تبلیغ سے باز نہ آؤ، اور کسی بدعمل کی خاطر دین کی اخلاقی تعلیمات میں، یا کسی منکرِ حق کی خاطر دین کے عقائد میں ذرہ برابر بھی ترمیم و تغیّر کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ جو کچھ حرام و ناجائز ہے اسے برملا حرام و ناجائز کہو، خواہ کوئی بدکار کتنا ہی زور لگائے کہ تم اس کی مذمت میں ذرا سی نرمی ہی برت لو۔ اور جو عقائد باطل ہیں انہیں کھلم کھلا باطل اور جو حق ہیں انہیں علانیہ حق کہو، چاہے کفار تمہارا منہ بند کرنے، یا اِس معاملہ میں کچھ نرمی اختیار کر لینے کے لیے تم پر کتنا ہی دباؤ ڈالیں۔

[۳۰] قرآن کا قاعدہ ہے کہ جہاں بھی کفار کے مقابلہ میں صبر و ثبات کی تلقین کی گئی ہے وہاں اُس کے معاً بعد

یہ لوگ تو جلدی حاصل ہونے والی چیز (دنیا) سے محبت رکھتے ہیں اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں[۳۱]۔ ہم نے ہی ان کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں، اور ہم جب چاہیں ان کی شکلوں کو بدل کر رکھ دیں[۳۲]۔ یہ ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرے۔ اور تمھارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے[۳۳]۔

اللہ کے ذکر اور نماز کا حکم دیا گیا ہے جس سے خود بخود یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دین حق کی راہ میں دشمنانِ حق کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جس طاقت کی ضرورت ہے وہ اسی چیز سے حاصل ہوتی ہے۔ صبح و شام اللہ کا ذکر کرنے سے مراد ہمیشہ اللہ کو یاد کرنا بھی ہو سکتا ہے، مگر جب اللہ کی یاد کا حکم اوقات کے تعین کے ساتھ دیا جائے تو پھر اس سے مراد نماز ہوتی ہے۔ اس آیت میں سب سے پہلے فرمایا وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۔ بُکرہ عربی زبان میں صبح کو کہتے ہیں۔ اور اَصیل کا لفظ زوال کے وقت سے غروب تک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس میں ظہر اور عصر کے اوقات آجاتے ہیں۔ پھر فرمایا وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ۔ رات کا وقت غروبِ آفتاب کے بعد شروع ہو جاتا ہے، اس لیے رات کو سجدہ کرنے کے حکم میں مغرب اور عشا دونوں وقتوں کی نمازیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد یہ ارشاد کہ رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو، نمازِ تہجد کی طرف صاف اشارہ کرتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حواشی ۹۲ تا ۹۷۔ جلد پنجم، المزمل، حاشیہ ۲)۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کے یہی اوقات ابتدا سے اسلام میں تھے، البتہ اوقات اور رکعتوں کے تعیّن کے ساتھ پنج وقتہ نماز کی فرضیت کا حکم معراج کے موقع پر دیا گیا۔

[۳۱] یعنی یہ کفارِ قریش جس وجہ سے اخلاق اور عقائد کی گمراہیوں پر مصر ہیں، اور جس بنا پر آپ کی دعوتِ حق کے لیے ان کے کان بہرے ہو گئے ہیں، وہ دراصل ان کی دنیا پرستی اور آخرت سے بے فکری و بے نیازی ہے۔ اس لیے ایک سچے خدا پرست انسان کا راستہ ان کے راستے سے اتنا الگ ہے کہ دونوں کے درمیان کسی مصالحت کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

[۳۲] اصل الفاظ ہیں اِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا۔ اس فقرے کے کئی معنی ہو سکتے ہیں

یقیناً اللہ بڑا علیم و حکیم ہے، اپنی رحمت میں جس کو چاہتا ہے داخل کرتا ہے، اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔[۳۳] ع ۲

ایک یہ کہ ہم جب چاہیں انہیں ہلاک کر کے اِنہی کی جنس کے دوسرے لوگ اِن کی جگہ لا سکتے ہیں جو اپنے کردار میں اِن سے مختلف ہوں۔ دوسرے یہ کہ ہم جب چاہیں ان کی شکلیں تبدیل کر سکتے ہیں، یعنی جس طرح ہم کسی کو تندرست اور سلیم الاعضاء بنا سکتے ہیں اسی طرح ہم اِس پر بھی قادر ہیں کہ کسی کو مفلوج کر دیں، کسی کو لقوہ مار جائے، اور کوئی کسی بیماری یا حادثے کا شکار ہو کر اپاہج ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ ہم جب چاہیں موت کے بعد ان کو دوبارہ کسی اور شکل میں پیدا کر سکتے ہیں۔

۳۳؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد پنجم، المُدثّر، حاشیہ ۱۴۔

۳۴؎ اس کی تشریح ہم اسی سورۃ کے دیباچہ میں کر چکے ہیں۔

جماعتِ اسلامی کا تاریخی کردار

عبدالحمید صدیقی

جماعت اسلامی کو قائم ہوئے انتیس برس ہو چکے ہیں اور اب تیسواں برس چل رہا ہے۔ اس طویل مدت میں اس نے اللہ کے فضل سے زندگی کے مختلف شعبوں میں مختلف خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان خدمات کی نوعیت اگرچہ مختلف ہے مگر ان سب کا مقصود و مطلوب ایک ہی ہے کہ دنیا میں اللہ کے دین کو سربلند کیا جائے اور آخرت میں فلاح و کامرانی حاصل کی جائے۔ ان خدمات کے جائزے کو ہم اس کا تاریخی کردار کہہ سکتے ہیں۔ اس جائزے کو زیادہ صحیح بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ایک طرف یہ دیکھیں کہ اس جماعت نے کیا کچھ کیا ہے اور دوسری طرف اس بات پر بھی غور کر لیں کہ اگر جماعت کا وجود نہ ہوتا تو پھر صورتِ حال کیا ہوتی۔

ہم اپنی بحث کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

(۱) جماعت کی فکری خدمات،

(۲) جماعت کی عملی خدمات۔

فکری خدمات میں سب سے نمایاں خدمت یہ ہے کہ جماعت نے دین کے جامع اور ہمہ گیر تصوّر کو اجاگر کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ میری اس گزارش کا یہ مطلب نہیں کہ یہ جامع تصوّر کسی نہ کسی صورت میں پہلے سے موجود نہ تھا اور جماعت نے پہلی بار یہ انکشاف کیا ہے کہ اسلام ایک ایسا مکمل ضابطہ حیات ہے جو زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تصوّر قرآنِ کریم، حدیث، فقہ اور علمِ کلام کی کتابوں میں موجود تھا، اور دورِ اخیر میں بھی مسلمان کسی نہ کسی شکل میں اس تصور سے کسی حد تک

شناسا تھے۔ اپنے اس دور میں علامہ اقبال مرحوم اور مولانا آزاد مرحوم کی تحریروں میں اس کی جھلک ملتی ہے۔ مگر یہ بات کسی فخر کی بنا پر نہیں بلکہ محض تحدیثِ نعمت کے طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اس تصوّر کو نکھارنے اور اس کے ہر پہلو کو نہایت واضح اور عام فہم طریقہ سے پیش کرنے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اور اسے پھیلانے میں جماعت اسلامی کی تنظیم اور اس کے کارکنوں نے بیش قیمت خدمات سرانجام دی ہیں۔ یہ ان خدمات ہی کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمانوں میں لاکھوں پڑھے لکھے لوگ اسلام کو اس کی تفصیلی صورت میں جان گئے ہیں اور ان کے اندر یہ تڑپ پیدا ہو چکی ہے کہ اُن کی سیاست، اُن کی معیشت، اُن کی معاشرت اُن کی تہذیب۔ ان کی عدالت۔ ان کی تعلیم، غرض ان کی ہر چیز اسلام کی بنیاد پر استوار ہونی چاہیے اور اُن کی زندگی کے مختلف شعبوں میں اتنی ہم آہنگی پائی جانی چاہیے کہ وہ سب ایک ہی رُخِ زیبا کے مختلف عکس دکھائی دیں۔ یہ احساس اور جذبہ اس دور میں کس شدت کے ساتھ پیدا ہوا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب اسلامی سیاست، اسلامی معیشت، اسلامی معاشرت اور اسلامی تہذیب پر مسلمان اہلِ علم نے بڑی سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا ہے اور ان موضوعات پر بازار میں دھڑا دھڑ کتابیں آ رہی ہیں جن میں بعض بڑی وقیع ہونے کے علاوہ اسلام کے صحیح نقطۂ نظر کی ترجمانی بھی کرتی ہیں۔ اسلامی نظامِ حیات کو ایک جامع نظامِ حیات کی حیثیت سے پیش کرنے کی سعی و کوشش گذشتہ دو سو سال میں کبھی اتنی شدید، اتنی وسیع اور اتنی گہری نہ تھی جس قدر کہ آج نظر آ رہی ہے۔

پھر ان تحریروں میں اس احساس کا بھی واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ مسلمان اسلامی نظامِ حیات کو اب ایک ایسا آئیڈیل نہیں سمجھتے جو صرف قابلِ تحسین ہو اور جسے عملی زندگی میں اپنایا نہ جا سکتا ہو، بلکہ اُن کے نزدیک اس نظام کا قیام عملی اعتبار سے بالکل ممکن ہے اور اس کے اپنانے ہی سے نوعِ انسانی فلاح و کامرانی پا سکتی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ اسلامی ریاست یا مملکت پر نظریاتی مباحث کے علاوہ اس ریاست کے عملی پہلوؤں پر بھی ایک اچھا خاصا ذخیرہ کتب مہیا ہو گیا ہے۔ مثلاً پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے کیا عملی تدابیر اختیار کرنی چاہییں، اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق کیا ہیں، اسلامی ریاست پر کس قسم کی معاشی اور معاشرتی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اسلامی ریاست کے دوسری ریاستوں سے تعلقات

کی نوعیت کیا ہے، یہ اور اسی قسم کے دوسرے عملی مسائل سے آج کے اہلِ علم کا اغماض اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ مسلمان اسلامی ریاست کو ایک ناقابلِ حصول نصب العین نہیں سمجھتے، کیونکہ اگر وہ اسے محض ایک آئیڈیل خیال کرتے تو اس کے عملی پہلوؤں پر کبھی اس قدر شرح و بسط سے بحث نہ کرتے جتنی کہ ان دنوں میں ہو رہی ہے۔ اسی طرح اسلام کے نظامِ معیشت پر جس قدر ان گزشتہ چند سالوں میں لکھا گیا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں لکھا گیا تھا۔ ہمارے ہاں معاش کے متعلق عام طور پر یہ تصور پھیلا ہوا تھا کہ اسلام صرف معادت سے بحث کرتا ہے معاش سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ فاقہ مستی ایک مسلمان کا امتیازی وصف ہے اور جو مسلمان معاشی اعتبار سے جتنا تنگ دست ہے اسی قدر روحانی اعتبار سے سربلند ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ تصور اسلام نے دیا ہے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کے ہاں معیشت کے بارے میں اسی قسم کے تصورات رائج تھے۔ اس غلط تصور کو مٹانے میں اگرچہ بہت سے دوسرے مسلمان اہلِ علم نے بھی اپنی حد تک قابلِ قدر کوششیں کی ہیں مگر صحیح بات یہ ہے کہ اسلامی نظامِ معیشت کے صحیح خدوخال کو جس طرح مولانا مودودی نے اجاگر کیا ہے اور جس تفصیل سے انہوں نے یہ بتایا ہے کہ اسلام کے معاشی اصول کیا ہیں، سرمایہ داری اور سوشلزم کے اصولوں اور اسلام کے اصولوں میں فرق کیا ہے اور اسلام کے اصولوں پر موجودہ زمانے میں کس طرح ایک اعلیٰ اور برتر معاشی نظام قائم ہو سکتا ہے، اس کی نظیر ہمارے معاشی ادب میں پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اب سے تیس سال پہلے کے لٹریچر اور آج کے لٹریچر کا تقابل کیا جائے تو ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس دوران میں کتنا بڑا فرق واقع ہو چکا ہے اور اس فرق کے واقع ہونے میں سب سے بڑا حصہ کس کا ہے۔

مولانا سے پہلے اس موضوع پر ہمیں دو مختلف اور متضاد رجحانات ملتے ہیں۔ ایک وہ جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یعنی فقر و فاقہ کو معاشی نصب العین قرار دینا۔ دوسری طرف جن لوگوں نے اس کے مخالف سوچا اور کہا اُن کا نقطۂ نظر یا تو سرمایہ دارانہ نظام سے متاثر تھا یا سوشلزم سے متاثر ہو رہا تھا۔ اسلام کے نظامِ معیشت کی ایسی تعبیریں پیش کی جا رہی تھیں جنہیں دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسلام اپنا کوئی الگ نظامِ معیشت بھی رکھتا ہے جو ان دونوں سے بالکل مختلف ہے

اُس زمانے کی تحریروں کی روشنی میں اسلام یا تو سرمایہ دارانہ نظام سے مصالحت کرتا نظر آتا ہے یا پھر اشتراکی نظام سے۔ ان کے مقابلے میں جماعت نے معیشت پر جو لٹریچر شائع کیا ہے، جس میں زیادہ حصہ مولانا کی تحریروں کا ہے، اس میں یہ بات پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ اسلام نہ معاشی مسائل سے بے تعلق ہے، نہ فقر و فاقہ کو فروغ دینے کے لیے دنیا میں آیا ہے، اور نہ سرمایہ داری اور اشتراکیت سے اس کی کوئی مصالحت ہو سکتی ہے۔ جماعت کے لٹریچر نے معیشت کے بارے میں اسلام کا جو صحیح زاویۂ نگاہ پیش کیا ہے اُسے چند نکات پر مشتمل کہا جا سکتا ہے:

(۱) اسلام تمام رائج الوقت نظاموں سے الگ اپنا ایک مستقل نظامِ معیشت رکھتا ہے جس کی بنیاد اخلاق پر رکھی گئی ہے۔ معیشت کو اخلاق سے الگ نہیں کیا جا سکتا

(۲) مسلمان کے معاشی محرکات اُس کے دوسرے محرکات کی طرح خدا پرستی اور فکرِ آخرت کے چشمے سے پھوٹتے ہیں اس لیے دنیا میں اگرچہ ایک مسلمان معاشی فلاح و بہبود اور معاشی رزق کے لیے کسی کافر سے کم جدوجہد نہیں کرتا، لیکن اس کی یہ ساری جدوجہد حدود اللہ کے اندر رہتی ہے، اور اس طرح اس کی معاش اس کی معاد سے متصادم نہیں ہوتی بلکہ دیانت کے ساتھ دنیا کمانا ہی اس کی اُخروی فلاح کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

(۳) دنیا مسلمان کے برتنے کے لیے ہے، اس لیے نہیں ہے کہ وہ اسے چھوڑ دے یا اس سے منہ موڑ لے۔ لیکن دنیا کمانا اس کا مقصدِ زندگی بھی نہیں ہے کہ وہ اس میں مستغرق ہو کر نرا معاشی حیوان بن جائے اور ہر جائز و ناجائز ذریعہ سے دولت سمیٹنے اور صرف اپنی اغراض و خواہشات پر جائز و ناجائز طریقے سے اس کو صرف کرنے میں لگا رہے۔ مسلمان کا کام یہ ہے کہ دولتِ دنیا کمانے کے معاملے میں وہ بہر حال حرام طریقوں سے بچے اور حلال طریقوں سے کمانے ہی پر اصرار کرے۔ اس طرح اگر وہ امیر کبیر بھی بن جائے تو اسلام کو اس پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ یہ اللہ کا فضل ہے۔ اور اگر ان حدود کی پابندی کرنے کی وجہ سے وہ تنگ دستی اور فاقہ کشی میں بھی مبتلا ہو جائے تو اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ وہ صبر کے ساتھ اسے برداشت کرے۔ یہ دونوں حالتیں اسلام کی نگاہ میں مسلمان کے لیے آزمائش کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دولت مند ہونے کی صورت

میں اس کی آزمائش یہ ہے کہ وہ اپنی دولت میں سے خدا اور بندوں کے حقوق ادا کرتا ہے یا نہیں، اور اپنی دولت کو حرام مقاصد کے لیے استعمال کرنے سے پرہیز کرتا ہے یا نہیں۔ اور تنگ دستی کی صورت میں اس کی آزمائش یہ ہے کہ وہ کسی وقت پست ہمت ہو کر قبیح و مذموم اور ناپاک ذرائع اختیار کرنے پر تو آمادہ نہیں ہو جاتا۔ اسی بنیاد پر اسلام نے کسبِ دولت کے جائز اور ناجائز ذرائع کی صاف نشان دہی کی ہے، اور یہ بھی پوری وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ صرفِ دولت کی کیا صورتیں حرام اور کیا صورتیں حلال ہیں، اور یہ بھی غیر مشتبہ طریقہ سے متعین کر دیا ہے کہ ایک شخص کی دولت میں خدا اور بندوں کے کیا حقوق ہیں۔

(۴) معاش کے بارے میں اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرے کی بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔ . . . . -اسلامی معاشرے پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس بات کا اہتمام کرے کہ معاشرے کا کوئی فرد بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہے اور ہر شخص عزت کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ اس غرض کے لیے اسلام نے ہر محتاج اور ضرورت مند شخص کے حقوق اس کے اقربا پر، اس کے ہمسایوں پر، اس کی حاجت مندی سے واقف ہونے والے ہر مستطیع شخص پر، اور بالآخر پورے معاشرے پر عائد کیے ہیں۔ اور یہ حقوق ہیں "خیرات" نہیں ہیں۔ اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنی حدود کے اندر ناجائز استحصال کا قلع قمع کرے، کسبِ دولت اور صرفِ دولت کے معاملہ میں حدود اللہ کی سختی کے ساتھ پابندی کرائے۔ اپنی اجتماعی ذمہ داریوں سے جو لوگ عہدہ برآ نہ ہوں اُن سے بازپرس کرے، اور دولت مندوں کی دولت پر شریعت نے معاشرے کے جو حقوق عائد کیے ہیں انھیں حق داروں تک پہنچانے کا ایسا انتظام کرے جس سے معاشرے کا کوئی فرد غذا، لباس، مکان، علاج اور تعلیم سے محروم نہ رہ سکے۔

(۵) اسلام نہ بے قید آزاد معیشت کا قائل ہے اور نہ بالکل مقید معیشت کا قائل، بلکہ وہ پابندِ حدود آزاد معیشت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس ضمن میں جماعت اسلامی کے لٹریچر نے انفرادیت اور اجتماعیت کے درمیان اُس توازن کی واضح نشان دہی کی ہے جو قرآن و سنّت کی تعلیمات سے ثابت ہوتا ہے اور جو

حقیقت میں اسلام کے معاشی نظام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اس لٹریچر کے ذریعہ سے لوگوں کو اچھی طرح یہ سمجھا دیا گیا ہے کہ اسلام معیشت کے میدان میں نہ تو افراد کو اس قدر بے لگام چھوڑ دیتا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں معاشرے اور خصوصاً اس کے کمزور افراد کو اپنی حرص کا تختۂ مشق بنائیں اور نہ اجتماعی نظام کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ فرد کی آزادی کو بالکل کچل کر رکھ دے اور انسان معاشرے کے اندر اُس طرح بے دست و پا بن کر رہ جائے جس طرح کسی بے رحم مشین میں ایک پرزہ ہوتا ہے۔

(۶) معاشی میدان میں جماعت اسلامی کا سب سے بڑا کارنامہ اشتراکی فتنے کی مؤثر روک تھام ہے۔ ہمارے ہاں گزشتہ سو سال میں بدقسمتی سے یہ رجحان چلا آ رہا ہے کہ مغربی ممالک میں جس خیال، یا جس تحریک یا جس نظامِ فکر نے ذرا زور پکڑا، اُس کے بارے میں فوراً یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی گئی کہ اسلام اس سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ مغرب میں دولت پرستی کا جنون سوار ہوا تو ہمارے بعض مفکرین نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ دولت ہی "قاضی الحاجات" ہے اور مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح دولت مند بننے کی فکر کرنی چاہیے خواہ ذرائع کچھ ہی ہوں۔ اسی جنون کے تحت بنک کے سُود کو حلال قرار دیا گیا، انشورنس کی حوصلہ افزائی کی گئی اور بعض لوگوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر ہر قسم کی غیر اخلاقی اور غیر اسلامی معاشی سرگرمیوں کو سندِ جواز عطا کی۔ اس کے بعد جب اشتراکیت کو عروج حاصل ہوا تو یہاں بہت سے لوگ اسلام اور اشتراکیت کو یک جان و دو قالب قرار دینے لگے اور آج صرف دو دلفریب نعروں، یعنی معاشی انصاف اور معاشی مساوات کے نام پر اس عظیم فتنہ کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ ان حالات میں جبکہ سرمایہ داری نے غریب عوام پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے اور معاشی ابتری سے غریبوں کے لیے زندگی ایک عذاب بن گئی ہے، اس بات کا قوی امکان تھا کہ پاکستان کے مسلمان دھوکا کھا کر اس نئے عذاب کو اپنے اوپر مُسلط کر لیتے۔ بہت سے مسلمان ممالک میں یہی ہوا کہ سرمایہ داری سے ستائے ہوئے لوگوں نے اشتراکیت میں فلاح و کامرانی ڈھونڈنے کی کوشش کی اور اس کے پروگرام کو اسلامی معیشت کے پروگرام کا حصہ خیال کرتے ہوئے اسے آگے بڑھ کر اپنا لیا۔ انہیں اس بات کی توفیق ہی نصیب نہ ہوئی کہ وہ یہ دیکھیں کہ اس کے اصول اسلام سے

کس قدر متصادم ہیں، اور جن خرابیوں کا علاج وہ اشتراکیت میں تلاش کر رہے ہیں ان سے بڑھ کر شدید تر خرابیاں اشتراکیت پیدا کرتی ہے، اور ان خرابیوں کا اصل علاج اسلام میں ہے جس سے وہ دُور بھاگے جا رہے ہیں۔ وہ صرف چند کھوکھلے نعرے، مثلاً استعمار کا خاتمہ، معاشی استحصال کا خاتمہ، سرمایہ داری کا خاتمہ، سماجی انصاف، معاشی مساوات، وغیرہ سُن کر مسحُور ہو گئے اور اس ناگ کو سنہری طوق سمجھ کر گلے میں ڈال لیا۔ مگر اس طوق کو پہننے کے بعد اُن پر یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ اشتراکیت بھی سرمایہ داری کی طرح استحصال اور استعمار ہی ہے۔ یہاں بھی بڑے اشتراکی ملک چھوٹے اور کمزور ملکوں کو دامِ غلامی میں پھانس رہے ہیں اور انہیں خوب لوٹ رہے ہیں۔ یہاں بھی بندۂ مزدور کے اوقات اتنے ہی تلخ ہیں جتنے کہ سرمایہ داری میں ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ سرمایہ داری میں مزدور اس ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کا حق رکھتا ہے مگر اشتراکیت میں اسے یہ حق بھی حاصل نہیں۔

سرمایہ داری تو اب ایک دم توڑتا ہُوا نظام ہے۔ اس کی تباہ کاریاں سب کے سامنے کھل کر آچکی ہیں۔ اس لیے اس کے خلاف ہر شخص بڑی دلیری سے بات کر سکتا ہے۔ ایک رُوبہ انحطاط نظریے یا نظامِ فکر کے خلاف آپ جو کچھ کہنا چاہیں کہہ دیں۔ یہ روشن خیالی اور ترقی پسندی کی دلیل ہے۔ سرمایہ داری نظام میں اب یہ طاقت بھی نہیں رہی کہ وہ اپنی تبلیغ کر سکے اور اپنی طرف دنیا کو دعوت دے سکے مگر اشتراکیت کا فتنہ دَورِ حاضر کا سب سے پُرزور فتنہ ہے اور ایک تبلیغی فتنہ ہے۔ اس کی تعریف و توصیف میں اشتراکی حکومتیں، اشتراکی ادیب اور شاعر اور اشتراکی ادارہ ہائے نشر و اشاعت زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں اور خود ہمارے ملک میں باہر سے بھی اس کا لٹریچر سیلاب کی طرح آرہا ہے اور اندر بھی اس بیرونی فتنے کا پانچواں کالم اسے پھیلانے اور زبردستی مسلط کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کر رہا ہے۔ اس کے مفاسد اور خطرات کی نشاندہی کرنا اسلام اور مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس ضمن میں جماعت نے جس بصیرت، جس مستعدی اور جس پامردی کا ثبوت دیا ہے اُس کے لیے خدا کا جس قدر شکر بجا لایا جائے اسی قدر کم ہے۔ چاہے کوئی اس کا اعتراف کرے یا نہ کرے، بہر حال یہ حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی ہی نے اس آتے ہوئے خطرے کو محسوس کیا، اسی نے بروقت مسلمانوں کو

نہیں ہے۔ مگر انہوں نے اپنے بیٹوں کے لیے وہ رائے قائم نہیں کی جو آپ اپنے بیٹے کے لیے کر رہے ہیں، بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو سامنے رکھا۔ آپ مجھے تفرقِ ملت سے ڈراتے ہیں، سو آپ یاد رکھیں کہ میں تفرقہ بین المسلمین کا سبب ہرگز نہ بنوں گا۔ میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ اگر سب مسلمان کسی راہ پر پڑ گئے تو میں بھی ان میں شامل رہوں گا۔"

"اس کے بعد عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ سے اس معاملے میں گفتگو فرمائی۔ انہوں نے شدت سے انکار کیا کہ میں اس کو کبھی قبول نہیں کروں گا۔ پھر عبداللہ بن زبیرؓ کو بلا کر خطاب کیا، انہوں نے بھی ایسا ہی جواب دیا۔"

اجتماعی طور پر معاویہؓ کو صحیح مشورہ"

"اس کے بعد حضرت حسینؓ بن علیؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ جا کر معاویہؓ سے ملے اور ان سے کہا کہ آپ کے لیے یہ کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ آپ اپنے بیٹے یزید کے لیے بیعت پر اصرار کریں۔ ہم آپ کے سامنے تین صورتیں رکھتے ہیں جو آپ کے پیشرووں کی سنت ہے:

۱۔ آپ وہ کام کریں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کہ اپنے بعد کسی کو متعین نہیں فرمایا، بلکہ مسلمانوں کی رائے عام پر چھوڑ دیا۔

۲۔ یا وہ کام کریں جو ابوبکرؓ نے کیا کہ ایک ایسے شخص کا نام پیش کیا جو نہ ان کے خاندان کا ہے، نہ ان کا کوئی قریبی رشتہ دار ہے اور اس کی اہلیت پر بھی سب مسلمان متفق ہیں۔

۳۔ یا وہ صورت اختیار کریں جو حضرت عمرؓ نے کی کہ اپنے بعد کا معاملہ چھ آدمیوں پر دائر کر دیا۔ اس کے سوا ہم کوئی چوتھی صورت نہیں سمجھتے، نہ قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مگر معاویہؓ کو اس پر اصرار رہا کہ اب تو یزید کے ہاتھ پر بیعت مکمل ہو چکی ہے۔ اس کی مخالفت آپ لوگوں کو جائز نہیں ہے۔" "شہید کربلا" دارالاشاعت، مولوی مسافر خانہ، کراچی ص ۱۱ تا ۱۶

اب مولانا مودودی کی عبارتوں پر جس طرح کی حاشیہ آرائی اور ان سے جس طرح کا استنتاج مدیر البلاغ نے کیا ہے، اگر دوسرا شخص بھی وہی طریقہ اختیار کرے تو کہہ سکتا ہے کہ یزید کی بیعتِ ولایت عہد کے معاملہ کو "سازش"

میں بے نقاب ہو جائیں، اور انہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ یہ کس طرح ان کا دین اور ان کی دنیا دونوں کو برباد کر کے رکھ دیگا اور اس کے تسلّط سے عوام پر کیا عذاب نازل ہوگا۔ جماعت کی ان کوششوں کو قادرِ مطلق نے اس قدر بار آور کیا ہے کہ اب اسلام اور اشتراکیت میں نہایت واضح حدِ فاصل قائم ہو گئی ہے۔ اب جو شخص اشتراکیت کا علمبردار ہے وہ یا تو سوچ سمجھ کر اسلام سے منحرف ہو چکا ہے، یا دنیوی مفادات کی خاطر اس بے دینی کی حمایت پر کمربستہ ہے۔ مگر "مساواتِ محمدی" کے نام پر اب کوئی شخص اس سے دھوکا نہیں کھا سکتا۔ اشتراکی فتنے کا تجزیہ، اس کی فکری لغزشوں کی نشاندہی، اس کے بلند بانگ دعووں کا ابطال، اس کی عملی کمزوریوں کی وضاحت، اس کا اسلام سے قدم قدم پر تصادم، اور مسلمانوں اور مسلم ممالک پر اس کی تاخت کے نتائج، ان سب پہلوؤں میں سے کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں رہا جو اب عوام کی نظروں سے اوجھل رہ گیا ہو۔ جماعت نے اس سلسلے میں جو لٹریچر شائع کیا ہے وہ بڑا ٹھوس اور عام فہم ہے۔

دوسرے ممالک میں مسلم عوام دھوکے میں مارے گئے۔ ان کے سامنے اس فتنے کے سارے پہلو نمایاں نہ ہوتے۔ انہوں نے اسے استعمار سے نجات کا راستہ خیال کرتے ہوئے قبول کر لیا مگر بعد میں انہیں معلوم ہوا کہ اُن کے ساتھ ایک شرمناک کھیل کھیلا گیا ہے اور اُن پر ایک ایسا استعمار مُسلّط ہو گیا ہے جو نہ صرف انہیں معاشی طور پر بے بس بناتا اور اُن کا خون چوستا ہے بلکہ اُن کی زبانوں پر بھی پہرے بٹھا دیتا ہے، اور ان کے لیے مسلمان رہنا بھی مشکل کر دیتا ہے۔ پاکستان خوش قسمت ہے کہ یہاں مسلمانوں کو اس سے بروقت خبردار کر دیا گیا اور اشتراکیوں کے لیے یہاں وہ کامیابی حاصل کرنا ممکن نہ رہا جو انہیں دوسرے مسلمان ملکوں میں حاصل ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اشتراکیت کے علمبردار سب سے زیادہ جماعت اسلامی کو کوستے ہیں اور اپنا سارا زور اس کے خلاف صرف کر رہے ہیں، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہاں جماعت اسلامی نہ ہوتی تو وہ آسانی سے اس ملک کو بھی شکار کر لیتے۔ جماعت سے اُن کی شدید ناراضگی اور غیظ و غضب کا اظہار اُن کی تحریروں اور تقریروں سے برابر ہوتا رہتا ہے۔ مجھ سے ایک مرتبہ ایک بہت بڑے اشتراکی نے جو نہ صرف

اشتراکی نظریات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں بلکہ اس تصادم کی نوعیت کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں، خود کہا کہ جماعت اسلامی نے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ ہمیں ایک ایک انچ زمین کے لیے لڑنا پڑیگا۔[1] اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہ ہے کہ اب ہم پاکستان پر طوفان کی طرح نہیں چھا سکتے بلکہ عوام اشتراکیت کو اتنی اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ وہ ہمارے فریب میں آکر اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے ہمیں قدم قدم پر مزاحمت پیش آئے گی اور ہمارا قافلہ اگر بڑھے گا بھی تو آہستہ آہستہ بڑی مشکل سے آگے بڑھے گا۔ یہ اپنی مشکلات کا ماتم جو ایک اشتراکی بیان کر رہا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ آخر سوچیے کہ دوسرے ممالک میں یہ صورتِ حال کیوں پیدا نہیں ہوئی؟ ظاہر ہے کہ وہاں کے مسلم اہلِ فکر اوّل تو اس فتنے کو بروقت نہ سمجھ سکے، اور اگر اسے سمجھے بھی تو اس تحریک کی فتنہ سامانیوں کا وہ صحیح طور پر اندازہ نہ کر سکے جس کی وجہ سے وہ اس کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہو گئے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ پاکستان میں اس کا سب سے زیادہ کریڈٹ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کو جاتا ہے۔ (باقی)

---

[1] یہ فقرہ انہوں نے انگریزی میں فرمایا تھا جو یہ تھا:

WE SHALL HAVE TO FIGHT
FOR EVERY INCH OF LAND

فقر و فاقہ اور اس کا اسلامی حل

(۸)

از: یوسف القرضاوی ۔ ترجمہ و تلخیص: عبدالحمید صدیقی

زکوٰۃ انصاف کے ساتھ عائد کی گئی اسلام نے مال پر زکوٰۃ مقرر کرنے میں بڑے عدل و انصاف سے کام لیا ہے ۔ اس نے دولتمند کی محنت کا بھی خیال رکھا ہے اور غریب و نادار کے حق کا بھی ۔ دولتمند کے ساتھ ناانصافی نہیں کی گئی اور فقیر کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا گیا ۔ ابن قیم اپنی مشہور کتاب زادالمعاد میں "زکوٰۃ کے بارے میں فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم" کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں :-

"زکوٰۃ کے سلسلہ میں آپؐ کا طرزِ عمل ہر لحاظ سے کامل و مکمل تھا ، وقت کے لحاظ سے بھی ، قدر کے لحاظ سے بھی ، نصاب کے لحاظ سے بھی اور مصرفِ زکوٰۃ میں بھی ۔ اس میں اربابِ اموال اور غرباء و مساکین دونوں کی ضروریات و مصالح کا پُورا پُورا لحاظ رکھا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو مال اور صاحبِ مال کے لیے باعثِ طہارت بنایا ہے ۔ چنانچہ اسے صرف اغنیاء پر ہی واجب کیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جو زکوٰۃ ادا کرتا ہے وہ زوالِ نعمت سے محفوظ رہتا ہے ، بلکہ اس کے مال میں برکت اور افزائش ہوتی ہے اور آفات کو اس سے دُور کر دیا جاتا ہے ۔ اس طرح گویا زکوٰۃ ادا کرنا زکوٰۃ ادا کرنے والے کے لیے ایک قسم کی حفاظت ، فصیل اور قلعہ بن جاتا ہے ۔"

زکوٰۃ سال میں صرف ایک بار فرض ہے ۔ نیز اسے پھلوں اور فصلوں کے پکنے اور مکمل ہونے کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے ۔ اور یہ سب سے زیادہ منصفانہ قانون ہے کیونکہ ہر ماہ یا ہر جمعہ اسے فرض قرار دینا صاحبِ مال کے لیے ضرر رساں تھا اور عمر میں صرف ایک بار فرض کرنا مساکین کے حق میں نقصان دہ تھا ۔ چنانچہ سال میں ایک بار فرض کرنا فی الحقیقت سب سے زیادہ منصفانہ ہے ۔ پھر حصولِ دولت کے لیے صاحبِ دولت کی کوشش و محنت اور کلفت و مشقت کو دیکھ کر زکوٰۃ کی مقدار میں بھی فرق کر دیا گیا ۔ چنانچہ ایسی دولت جو کسی شخص کو اپنا ... جمع شدہ مل جاتے ... رکاز (دفینہ) ، تو اس پر خمس (پانچواں حصہ)

فرض کیا گیا اور اس کے لیے سال کا گزرنا شرط قرار نہیں دیا گیا بلکہ جونہی ایسا خزانہ ملے خمس کی ادائیگی واجب ہو جاتی ہے۔ رہے پھل اور فصلیں جن میں انسان کو حصولِ دولت کے لیے اس سے زیادہ محنت و مشقت کرنا پڑتی ہے، اس پر ایک زسے نصف یعنی عشر (دسواں حصہ) زکوٰۃ لگائی گئی کیونکہ زمین کی درستی، آبپاشی اور بوائی وغیرہ پر زیادہ محنت و مشقت سے سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ تو اُن فصلوں اور باغات کے متعلق ہے جن کی آبیاری قدرتی ذرائع آبپاشی سے ہوتی ہے اور انسان کو پانی وغیرہ خریدنے یا کنواں وغیرہ کھودنے کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی۔ مگر جس زمین کی آبیاری کے لیے انسان کو تکلیف اٹھانی پڑتی ہے یعنی وہ اس کی آبیاری نہروں اور نالیوں یا کنووں سے کرتا ہے اس کی پیداوار پر نصف عُشر (یعنی بیسواں حصہ) زکوٰۃ فرض کی گئی ہے۔ اور جب مال و دولت کی بڑھوتری کا انحصار صاحبِ مال کی مسلسل محنت و کوشش پر ہو یعنی وہ اس کے لیے کبھی تو سفر کی صعوبتیں برداشت کرے اور کبھی حصولِ زر کے ذرائع (مثلاً دکان کارخانہ اور دیگر تجارتی ادارے وغیرہ) کے انتظام و انصرام اور نگرانی کی تکلیف اٹھائے تو ایسی صورت میں مال کا رُبع عشر (چالیسواں حصہ) زکوٰۃ مقرر کی گئی ہے۔

بلاشبہ مؤخر الذکر کام میں فصلوں اور پھلوں کی پیداوار سے زیادہ تکلیف اور مشقت اُٹھانا پڑتی ہے، اور فصلوں اور پھلوں کی پیداوار میں تجارت کی نسبت ترقی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا تجارتی مال کی نسبت فصلوں اور پھلوں پر زیادہ زکوٰۃ مقرر کی گئی ہے۔ اور جس زمین کو بارش یا نہروں سے سیراب کیا جائے اس کی نمو اور پیداوار اس زمین سے زیادہ ہوتی ہے جس کو پن چکیوں کا ریزوں اور نالیوں وغیرہ سے سیراب کیا جائے۔ اور ایک جگہ جمع شدہ مال یعنی دفینہ مل جائے تو یہ صورت حصول زر کی مذکورہ بالا تمام صورتوں سے زیادہ نفع بخش اور آسان ہے۔ پھر چونکہ مال کی ہر مقدار کا مالک اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں کی مدد کر سکے اس لیے مال کی ایک خاص مقدار بطور نصاب مقرر کر دی گئی ہے کہ صرف بقدر نصاب مال رکھنے والے ہی پر فریضہ زکوٰۃ عائد ہوتا کہ اربابِ مال کے ساتھ بھی زیادتی نہ ہو اور فقراء و مساکین کی ضرورت بھی پوری ہو جائے۔

پروردگار عالم نے صدقات کو آٹھ حصوں میں تقسیم فرمایا ہے جو انسانوں کی دو قسموں میں پائے جاتے

ہیں۔ پہلے تو وہ لوگ ہیں جو کسی حاجت و ضرورت کے پیش نظر صدقہ لیتے ہیں اور حاجت کی شدت و کمی اور کثرت و قلت کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ ان لوگوں میں فقراء و مساکین، غلام اور مسافر وغیرہ آتے ہیں۔ اور دوسرے وہ ہیں جو منفعت کے لیے لیتے ہیں۔ ان میں زکوٰۃ جمع کرنے والے، مؤلفۃ القلوب اور اصلاح ذات البین کے لیے قرض یا تاوان وغیرہ ادا کرنے والے اور راہ حق کے مجاہد شمار ہوتے ہیں۔ اگر زکوٰۃ و صدقات لینے والا محتاج نہ ہو اور اُسے صدقہ دینے میں مسلمانوں کے لیے کوئی منفعت نہ ہو تو ایسے شخص کے لیے زکوٰۃ میں کوئی حصہ نہیں۔

زکوٰۃ کے بارے میں حکومت کی ذمہ داری | زکوٰۃ، جیسا کہ واضح ہو چکا، ایک مقرر و مسلّم حق ہے۔ یہ خداوند عالم کی طرف سے فرض کیا گیا ہے۔ اور یہ ایسا حق نہیں جسے افراد کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے کہ ان میں سے جو فرد اللہ اور آخرت پر یقین رکھتا ہو وہ تو اسے ادا کر دے اور جس کا یقین آخرت پر کمزور ہو اور خوف الٰہی سے بھی اسے بہرہ کم تر ملا ہو، وہ اسے ادا نہ کرے۔ یہ انفرادی احسان نہیں بلکہ ایک اجتماعی انتظام ہے جو حکومت کی زیر نگرانی کام کرتا ہے اور ایک سرکاری ادارہ اسے چلاتا ہے۔ وہ ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرتا ہے جن پر زکوٰۃ فرض ہے اور اُن لوگوں کو دیتا ہے جن کے لیے یہ فرض کی گئی ہے۔

قرآنی دلیل | اس پر سب سے واضح ترین قرآنی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کے کام کی نگرانی کرنے والوں کا اکٹھے اور الگ الگ ذکر فرمایا ہے۔ انہیں عاملین علیہا سے موسوم کیا ہے۔ زکوٰۃ کے مال میں اُن کا بھی حصہ رکھ دیا ہے۔ اور انہیں اس بات کا محتاج نہیں رکھا کہ وہ کسی دوسرے ذریعے سے اپنی تنخواہیں لیں تاکہ انہیں معاشی طور پر تحفظ حاصل ہو جائے اور وہ اپنے کام کو با حسن وجوہ انجام دے سکیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنَ	صدقات تو بس فقیروں، مسکینوں اور عاملین کیلئے
وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ	ہیں جو ان صدقات کے وصول اور تقسیم کرنے
فِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	پر مقرر ہیں۔ اور ان کے لیے ہیں جن کے دلوں میں

وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (سورہ توبہ: ۶۰)

اُلفت دلانی ہے۔ اور گردنوں کے چھڑانے اور قرضداروں کے قرض ادا کرنے اور اللہ کی راہ اور مسافر کے زادِ راہ میں (خرچ ہونے چاہییں)۔ فرض ہے اللہ کی طرف سے! اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

کتاب اللہ کی اس نصِ صریح کے بعد کسی تاویل اور ڈھیل اور ظن و قیاس کی گنجائش نہیں۔ خاص کر اس کے بعد تو بالکل ہی گنجائش نہیں ہو سکتی جب کہ اس آیت نے مستحقینِ زکوٰۃ و صدقات کی اقسام اور حد بندی کو فریضۃً من اللہ کہہ دیا ہے۔ اب کون ہے جو اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرض کو معطل کرنے کی جرأت کر سکے؟

اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ ہی میں زکوٰۃ کے مصارف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ (توبہ: ۱۰۳)

لے لیجیے ان کے اموال میں سے صدقہ تاکہ آپ پاک کر دیں ان کو اور صاف کر دیں انہیں اس صدقے کے ذریعے اور دعا کیجیے اُن کے حق میں بلاشک آپ کی دُعا اُن کے لیے وجہِ تسکین ہے۔

متقدم و متاخر جمہور مسلمانوں کا یہی مذہب ہے کہ اس آیت میں صدقہ سے مُراد زکوٰۃ ہے اور خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ہر اس شخص سے ہے جو بعد میں مسلمانوں کا والی ہو۔

سُنّتِ نبوی ابنِ عباسؓ سے مروی جو مشہور حدیث صحیحین وغیرہ میں وارد ہے اس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مُعاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت ان سے فرمایا تھا: "جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ایک صدقہ فرض کیا ہے۔ جو اُن کے اغنیاء سے لے کر فقراء و مساکین کو دیا جاتا ہے۔ تم اغنیاء کو اس کے ادا کرنے کا حکم دینا اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو پھر دیکھو، اُن کے عمدہ اور بہترین مال مت لینا۔ اور مظلوم کی دُعا سے ڈرنا کیونکہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں۔"

اس حدیث کے جس حصّے کو ہم بطور استدلال پیش کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کا یہ فرمان اُس فرض شدہ صدقہ (زکوٰۃ) کے بارے میں ہے جو اغنیاء سے لے کر فقرائے اُمت کو دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک وصول کرنے والا زکوٰۃ وصول کرے اور ایک تقسیم کرنے والا اسے غرباء و مساکین میں تقسیم کرے نہ کہ اسے اُس شخص کے اختیار اور صوابدید پر چھوڑ دیا جائے جس پر اس کا ادا کرنا فرض ہے۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر فتح الباری شرح بخاری میں مذکورہ بالا حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "حضرت علی رضی اللہ عنہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حاکم وقت ہی زکوٰۃ کی وصولی اور اس کے صرف و تقسیم کا ذمہ دار ہوتا ہے، خواہ وہ یہ کام خود کرے یا اپنے کسی نائب کے ذریعے اسے انجام دے، اور جو شخص زکوٰۃ دینے سے انکار کرے اس سے جبراً وصول کرے۔"

یہ جو کچھ قولی حدیث میں وارد ہے اس کو اس سنتِ عملی اور تاریخی حقیقت سے اور بھی تقویت پہنچتی ہے جس پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اور آن کے بعد خلفائے راشدین کے زمانہ میں عمل ہوتا رہا ہے۔ اسی لیے علماء نے کہا ہے حاکمِ وقت کا یہ فرض ہے کہ وہ زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو بھیجے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے بعد خلفائے راشدین زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو بھیجا کرتے تھے۔ نیز چونکہ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو مالدار تو ہیں مگر اُن کو معلوم نہیں کہ ان پر مالدار ہونے کی صورت میں کیا کچھ واجب ہے، اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو کنجوس ہوتے ہیں، اس لیے زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو اُن کے پاس بھیجنا بہت ضروری ہے۔

قوم کے اربابِ اموال پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اس اہم فرض کی ادائیگی میں ان زکوٰۃ وصول کرنے والوں سے تعاون کریں اور جتنی زکوٰۃ اُن پر واجب ہوتی ہو وہ انہیں ادا کر دیں اور اموالِ زکوٰۃ میں سے کوئی شے بھی اُن سے پوشیدہ نہ رکھیں۔ یہی حکم ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اُن کے اصحاب کا۔

جابر بن عتیک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہارے پاس کچھ سوار آئیں گے جو تمہاری نظر میں ناپسندیدہ ہوں گے۔ جب وہ تمہارے پاس آئیں تو انہیں مرحبا کہو اور

جو کچھ وہ کرنا چاہیں انہیں کرنے دو۔ اگر وہ عدل وانصاف سے کام لیں گے تو یہ اُن کے حق میں اچھا ہوگا اور اگر وہ ظلم وزیادتی سے کام لیں گے تو وہ اپنے کیے کی خود سزا پائیں گے۔ ان کی خوشی اور رضا کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے زکوٰۃ پوری ادا کر دی ہے اور انہیں چاہیے کہ وہ تمہارے لیے دعا کریں۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: جب میں آپ کے فرستادے کو زکوٰۃ ادا کر دوں تو کیا میں اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک اس سے بری الذمہ ہو جاؤں گا؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں، جب تم میرے فرستادے کو زکوٰۃ ادا کر دو گے تو تم اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک اس سے بری الذمہ ہو جاؤ گے۔ اور تم اس کے اجر کے مستحق ہو جاؤ گے۔ اور گناہ کا مستحق وہ ہوگا جو اس میں ردوبدل کرے گا۔"

صحابہ کرامؓ کے فتوے: سہل ابن ابوصالح اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا "میرے پاس کچھ مال جمع ہو گیا جو نصابِ زکوٰۃ کو پہنچ گیا تھا۔ میں نے سعد ابن ابی وقاص، ابن عمر، ابوہریرہ، ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا کہ کیا میں اُسے خود ہی تقسیم کر دوں یا حاکم وقت کے حوالے کر دوں؟ سب نے مجھے حکم دیا کہ حاکم وقت کے حوالے کر دو اور کسی نے بھی کوئی مختلف بات نہ کہی۔ ایک روایت میں ہے کہ میں نے اُن سے کہا: "یہ حاکم وقت جو کچھ کرتا ہے آپ جانتے ہیں (یہ واقعہ بنوامیہ کے عہد کا ہے) تو کیا میں ایسے لوگوں کو اپنی زکوٰۃ دے دوں؟" اُن سب نے کہا "ہاں دے دو۔" اس حدیث کو سعید بن منصورؒ نے اپنی مُسند میں روایت کیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہا فرماتے ہیں کہ "اپنی زکوٰۃ اپنے اولی الامر کے حوالے کر دو۔ اُن میں سے جو اس کا صحیح استعمال کرے وہ اپنے ہی لیے بہتر کرے گا۔ اور جو اس کا غلط استعمال کرے گا تو اس کا وبال اسی پر ہوگا۔"

حضرتِ مُغیرہ بن شعبہ کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے اپنے ایک غلام سے کہا جو طائف میں اُن کی جائیداد کا نگران تھا، تم میرے مال کی زکوٰۃ اور صدقات کو کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا۔ ان میں سے

لے بیہقی نے اسے صحیح یا حسن سند سے روایت کیا ہے۔

اسلامی ریاست کا ایک اور قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعے دنیا میں اُن اخلاقی اقدار کو فروغ ہوتا ہے جو حیاتِ اجتماعی میں توازن اور ٹھہراؤ پیدا کرتی ہیں۔ جب کسی مملکت میں حاکمیت انسان کی تسلیم کی جاتی ہے تو قدرتی طور پر اس میں انسان کے بنائے ہوئے ضابطے اور قوانین نافذ ہوں گے۔ ظاہر بات ہے کہ کسی ملک کے سارے عوام ایک ہی جیسی قوت اور ایک جیسے اختیارات کے ساتھ تو قانون سازی میں شریک نہیں ہو سکتے۔ یہ کام انہیں مجبوراً اپنے میں سے ایک گروہ کو ہی سونپنا پڑتا ہے۔ یہ گروہ اس کے لیے اپنے خیال کے مطابق ضابطۂ حیات مرتب کرتا ہے۔ اس سلسلے میں دو بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ایک تو انسانوں کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے ذاتی رجحانات اور میلانات کو یکسر نظر انداز کر کے محض انسانیت کی فلاح و بہبود کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی ضابطہ تشکیل دے سکیں۔ انسان میں فطری طور پر اتنی مکمل بے لوثی نہیں آسکتی کہ وہ اپنی ذات سے بالکل الگ ہو کر سوچے۔ دوسرے اسے اپنی سربراہی قائم رکھنے کے لیے معاشرے کے ان بارسوخ افراد اور مضبوط گروہوں کی تائید کی ضرورت ہوتی ہے جن کے بل پر وہ اس مقام پر زیادہ دیر تک فائز رہ سکے۔ اس لیے وہ لازمی طور پر آئین و قانون کی تشکیل میں اپنے ان مؤید گروہوں اور طبقات کا خیال رکھتا ہے اور نظامِ حیات اس انداز سے مرتب کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے اس کے حامی طبقوں کو زیادہ سے زیادہ دنیوی مراعات حاصل ہوں۔ اس لیے انسان جو نظام ترتیب دیگا اس میں لازمی طور پر بعض طبقوں کے حقوق پامال ہوں گے اور بعض کو اپنے جائز حصے سے زائد فوائد حاصل ہونے کا التزام ہوگا۔ انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی ضابطۂ حیات میں تمام انسانوں کے ساتھ پوری طرح عدل و انصاف کا معاملہ کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک معاشرے کے اندر ہی ایک دوسرے کے مخالف طبقات پیدا ہو جاتے ہیں اور اس طرح ملک کے اندر لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور متوازن اور جامع نظامِ حیات نہ ہونے کی وجہ سے ملک مستقل طور پر بدامنی کا شکار رہتا ہے۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں آپ کسی ملک کا جائزہ لیں تو آپ وہاں بے چینی، اضطراب اور عدمِ تحفظ کی عام فضا پائیں گے۔ ہر گروہ دوسرے گروہ کا شاکی اور ہر طبقہ دوسرے سے برسرِپیکار ہے

عزت، سارے معاشرے کی خوشحالی، اور قوموں اور حکومتوں کو سچائی اور بھلائی کی طرف متوجہ کرنا بھی شامل ہے۔ ہدایت کے اس مکمل نظام میں ایک شق زکوٰۃ کی بھی ہے جسے ادا کرنا اگرچہ فرد پر فرض ہے مگر اس کی تنظیم فرد کے فرائض میں نہیں بلکہ اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل کی گئی ہے چنانچہ اسلام میں زکوٰۃ کا جمع کرنا اور اُسے مستحق افراد و معاشرہ تک پہنچانا حکومت کے سپرد کیا گیا ہے نہ کہ اسے لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں جن سے شریعت اسلامی بے اعتنائی نہیں برت سکتی:

۱۔ معاشرے میں ایسے افراد بھی ہو سکتے ہیں جن کے ضمیر حُبّ دنیا اور حُبّ ذات کے سبب مردہ ہو گئے ہوں یا انہیں کوئی روحانی بیماری لاحق ہو گئی ہو۔ اگر فقرا و مساکین کے حق کو ایسے لوگوں پر چھوڑ دیا جائے تو اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ فقراء و مساکین کو ان کا حق لازمی طور پر مل جائے گا۔

۲۔ اگر فقیر اور محتاج شخص بجائے ایک دولت مند آدمی سے لینے کے حکومت سے اپنا حق وصول کرے تو اس کی عزتِ نفس اور آبرو محفوظ رہتی ہے اور اس کے احساسات مجروح نہیں ہوتے۔

۳۔ اگر تقسیمِ زکوٰۃ کے معاملے کو افراد پر چھوڑ دیا جائے تو تقسیم میں بدنظمی پیدا ہو جائے ہو سکتا ہے کہ اکثر دولتمند ایک ہی فقیر و محتاج کو زکوٰۃ دیتے رہیں اور دوسروں کو نظرانداز کر دیں اور وہ انہیں تقسیمِ زکوٰۃ کے وقت یاد تک نہ آئیں درآنحالیکہ وہ اس فقیر سے زیادہ محتاج ہوں۔

۴۔ زکوٰۃ کا مصرف صرف فقراء و مساکین اور مسافروں تک ہی محدود نہیں، بلکہ اس کے بعض مصارف وہ ہیں جن سے عامۃ المسلمین کا مفاد وابستہ ہوتا ہے، جس کا اندازہ افراد نہیں کر سکتے بلکہ مسلمانوں کی جماعت کے اولوالامر اور اہل شوریٰ ہی کر سکتے ہیں۔ مثلاً مؤلفۃ القلوب کو دینا، جہاد فی سبیل اللہ کے لیے ساز و سامان تیار کرنا۔ اور دنیا میں اسلام کی تبلیغ کے لیے مبلغین کو تیار کرنا۔

۵۔ اسلام دین بھی ہے اور حکومت بھی۔ قرآن بھی ہے اور سلطان بھی۔ اس سلطان اور حکومت کو بھی مال کی ضرورت ہے جس سے وہ اسلامی نظام قائم کر سکے اور اس سلسلے میں اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکے۔ اور اس مال کے حصول کے ذرائع کا ہونا بھی ضروری ہے۔ زکوٰۃ حکومت کے خزانے یا بیت المال کے لیے ایک بڑا اہم اور دائمی ذریعہ آمدنی ہے۔

زکوٰۃ کا بیت المال: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں یہ ایک بنیادی بات ہے کہ زکوٰۃ کے لیے ایک الگ بجٹ بنے اور آمدنی علیحدہ ہو جس میں سے صرف زکوٰۃ ہی کے مصارف پر خرچ کیا جائے۔ یہ خاص، انسانی اور اسلامی مصارف ہیں۔ اس مال کو حکومت کے عام بجٹ میں نہیں ملانا چاہیے جو اتنا وسیع ہوتا ہے کہ اس میں مختلف منصوبے آسکتے ہیں اور اس کی آمدنی مصارفِ زکوٰۃ کے سوا دوسرے مصارف میں خرچ ہوتی ہے۔ سورۂ توبہ کی جس آیت میں مصارفِ زکوٰۃ بیان کیے گئے ہیں اس میں فرمایا گیا ہے کہ زکوٰۃ کے جمع و تقسیم کا کام کرنے والے اپنی تنخواہیں زکوٰۃ ہی سے لیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کا ایک مستقل بجٹ ہو اور زکوٰۃ کے انتظام و انصرام پر اسی میں سے خرچ کیا جائے۔ زمانۂ قدیم کے مسلمان اس آیت سے یہی سمجھتے آئے ہیں۔ انہوں نے حکومتِ اسلامی کے بیت المالوں کو چار قسموں میں تقسیم کرتے ہوئے زکوٰۃ کا ایک الگ بیت المال مقرر کیا ہے:

۱۔ زکوٰۃ کا خاص بیت المال جس میں زکوٰۃ کی آمدنی، اس کے جمع کرنے کا انتظام اور حسبِ ضرورت اس کے مصارف پر اسے تقسیم کرنا شامل ہے۔

۲۔ جزیہ و خراج کی آمدنی کا بیت المال۔ جزیہ ایک ایسا مال ہے جو مسلمانوں کے درمیان رہنے والے غیر مسلموں سے اس شرط پر لیا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے نفع و نقصان میں ان کے شریک ہوں گے۔ جیسے مسلمانوں سے زکوٰۃ اور دوسرے صدقات مثلاً صدقۂ فطر، عبادات میں کمی بیشی اور گناہوں کے کفارے وغیرہ لیے جاتے ہیں۔ اسی طرح غیر مسلموں سے جزیہ لیا جاتا ہے۔ نیز جزیہ لے کر مسلمان حکومت غیر مسلموں کو فوجی خدمت میں شرکت کی تکلیف دیئے بغیر ان کا دفاع اور ان کی حفاظت کرتی ہے۔ اور خراج ایک قسم کا سالانہ ٹیکس ہے جو کسی رقبۂ زمین پر اس کی طاقت کے مطابق لگایا جاتا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوادِ عراق وغیرہ پر لگایا تھا۔

۳۔ غنائم اور رکاز کا بیت المال۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ رکاز وغیرہ زکوٰۃ میں سے نہیں اور اسے زکوٰۃ کے مصارف میں خرچ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ وہ ان کا بیت المال ہی الگ مقرر کرتے ہیں۔

۴۔ گم شدہ چیزوں کا بیت المال: ان میں وہ مال آتے ہیں جن کے مالکوں کا پتہ نہ چل سکے اور وہ مال

بھی آتے ہیں جن کا کوئی وارث نہ ہو۔

یہاں ہم جو کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلام میں زکوٰۃ رضا کارانہ طور پر کیے گئے احسان یا اُن شخصی نوافل میں سے نہیں ہے جنہیں صرف افرادِ معاشرہ کے قلب و ضمیر پر چھوڑ دیا گیا ہو کہ وہ چاہیں تو ادا کریں چاہیں تو نہ کریں، بلکہ یہ تو ایک فریضہ ہے جس کی نگرانی اور اس کے جمع کرنے اور پھر مستحق افراد میں تقسیم کرنے کا انتظام حکومت کے ذمے ہے۔ یہ ایک قسم کی عبادت ہے جس میں ٹیکس کی سی خاصیت ہے، یا ایک قسم کا ٹیکس ہے جس میں عبادت کی رُوح کارفرما ہے۔ لہٰذا اُس کی حفاظت اور ادائیگی کی نگرانی دو نگران کرتے ہیں۔ ایک خارجی نگران یعنی مسلمان حکومت اور سارا مسلم معاشرہ۔ دوسرا داخلی نگران جو مسلمان کے ضمیر، اس کے ایمان باللہ، رحمتِ حق کی امید اور عذابِ الٰہی کے خوف سے عبارت ہے۔ البتہ جب کوئی ایسی مسلمان حکومت موجود نہ ہو جو فقراء کے حق کی حفاظت کرنے اور اسے اشرار کے ہاتھوں سے بزور چھین لینے میں خلیفۂ اوّل سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سا طرزِ عمل اختیار نہ کر سکے تو پھر فقیر اُس اسلامی ضمیر کی کفالت میں رہے گا جو خدا سے امیدِ رحمت بھی رکھتا ہے اور اس سے ڈرتا بھی ہے اور جس کا ایمان اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص پیٹ بھر کر رات گزارے اور اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا ہو۔

(باقی)

معیشتِ اسلام ـــــ فکر و نظام

جناب عبدالمجیب صاحب

(۲)

۶ ـ اسلامی نظامِ معیشت کے نفاذ کے لیے عملی تدابیر

اسلام کے معاشی نظام کے عملی نفاذ کی مختلف تدابیر پر غور کرنے سے پہلے چند بدیہی حقائق کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

اوّلاً، یہ کہ اسلام کے معاشی احکام چونکہ محض معاشیت کے مسائل نہیں بلکہ زندگی کے مجموعی نظام کا ایک جزء ہیں اور درحقیقت اسلام میں معاشیات ایک مخصوص دینی، اخلاقی و روحانی دستور العمل کے تابع ہیں اس لیے اسلام کا معاشی نظام قائم کرنے وقت ملک کا پورا نظام (انفرادی و اجتماعی، سیاسی و معاشرتی اور دینی و دنیوی) اسلام کے مجموعی اصولوں پر استوار کرنا لازمی ہوگا۔ اسلامی نظام کے مختلف شعبوں کے درمیان ہم آہنگی ضروری ہے، ورنہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کسی چیز کو نافذ کرنا اور کسی کو نہ کرنا، یا کسی کو مقدم اور کسی کو مؤخر رکھنا مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔

ثانیاً یہ کہ اسلام کی پوری تعلیمات میں اوّل تا آخر حکمت، ترتیب اور تدریج کا خیال رکھا گیا ہے۔ حضور اکرمؐ کے زمانہ میں ہی تمام احکامات و قوانین نہ تو ایک دن میں نازل ہوئے اور نہ وہ ایک ہی روز میں نافذ کر دیئے گئے۔ دوسرے احکام کی طرح اسلامی قوانینِ معیشت کو بھی ترتیب کے ساتھ کئی مدارج میں عملی جامہ پہنایا گیا تھا۔ ایسی حکمتِ عملی کسی بھی قائم شدہ نظام کی تبدیلی کے لیے ضروری ہے، ورنہ ملک کا سماجی و معاشی ڈھانچہ تہس نہس ہو کر رہ جاتا ہے اور قوم کو اس کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ فوری تبدیلی اکھاڑ پچھاڑ کے ذریعہ ہی آسکتی ہے جس کے بعد اس بات کا قطعی خطرہ رہتا ہے کہ

آمریت مسلط کر دی جائے اور پیدائش دولت اور تقسیم دولت کے سارے ذرائع حکومت کی تحویل میں دے دیے جائیں۔ اس ترقی کا سبب ظاہر ہے کہ انسان کو جب حیوان کی سطح پر رکھ کر اس سے بے تحاشا کام لیا جاتا ہے تو اس سے قدر زائد کی بہت بڑی مقدار حکومت کی تحویل میں چلی جاتی ہے جسے صنعتی ترقی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ تجزیہ بالکل آسان اور سادہ ہے۔ مگر انسان کو اس طرح حیوان بنانے کے اخلاقی اور روحانی نقصانات کے صحیح اندازے کے لیے ایک طویل مدت درکار ہے۔ انسان کو اس اشتراکی تجربے سے جو اخلاقی نقصانات پہنچیں گے ان کی صحیح نوعیت عرصۂ دراز کے بعد ہی سامنے آئے گی اور طویل اور صبر آزما مراحل سے گزر کر ہی انسان اس بات کا فیصلہ کر سکے گا کہ اس نے اس تجربے میں کیا پایا اور کیا کھویا ہے۔ انسان کے پاس وحی الہام ہی ایک قابلِ اعتماد ذریعہ ہے جس کی مدد سے وہ کسی فعل کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کا اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے اور اسے بربادی سے بچنے کے لیے بار بار بربادی کے مراحل سے گزرنا نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے وحی کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ انسانی تجربات کی کفایت ہے ITISAN ECONOMY OF HUMAN EXPERIENCE۔ یعنی جس نتیجے پر انسان لاکھوں ٹھوکریں کھا کر بعد از خرابیٔ بسیار پہنچتا ہے قادرِ مطلق انسان کو اس کے متعلق پہلے قدم پر ہی آگاہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست جس کا دستور قرآن و سنت کی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے اس میں انسان بربادیوں کے ان روح فرسا تجربات سے نہیں گزرتا بلکہ اپنی قوتوں کو وحی و الہام کی روشنی میں تعمیری کاموں پر لگاتا ہے اور دنیوی اور اخروی فلاح حاصل کرتا ہے۔

تصحیح

تفہیم القرآن جلد اوّل اور جلد دوم میں حسب ذیل مقامات کی تصحیح کر لی جائے:

جلد اوّل: صفحہ ۴۰۶ سطر ۸ - "اور اس کے رسولوں پر" کے بجائے "اور اس کے رسول پر"

جلد دوم: صفحہ ۲۱۳ سطر ۱۲ "اور اس کے رسول کی" کے بجائے "اور اللہ اور اس کے رسول کی"

اس تمہید کے بعد اب مختصراً وہ تجاویز و تدابیر شعبہ وار پیشِ خدمت ہیں جن کو بروئے کار لا کر موجودہ ظالمانہ معاشی نظام کی جگہ اسلامی نظامِ معیشت قائم و نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے عملی نفاذ کی تکمیل تک ہر شعبہ کی انتظامیہ کے اوپر ماہرین کے الگ الگ کمیشن مقرر کیے جائیں جو انتظامیہ کی رہنمائی و رہبری کا کام انجام دیتے رہیں۔

(الف) شعبۂ زراعت

(۱) تمام زمینداریوں اور جاگیرداریوں کی تحقیق کی جائے اور ناجائز طریقوں سے عطا کردہ یا حاصل کردہ زمین بغیر کسی معاوضہ کے واپس لے لی جائیں۔

(۲) جائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی زرعی زمین اگر مالکانِ زمین کے پاس تین سال سے زیادہ غیر کاشت شدہ پائی جائیں تو ان پر ایسی پابندیاں عائد کی جائیں جن سے وہ زمین کو زیرِ استعمال لانے پر مجبور ہو جائیں۔ البتہ یہ اصول ان کم حیثیت مالکانِ زمین پر عائد نہ کیا جائے جو کسی معقول وجہ سے کاشت نہ کر سکے ہوں مثلاً کوئی غریب بیوہ جو کسی مناسب آدمی کے نہ ملنے کی وجہ سے اپنی زمین زیرِ کاشت نہ لا سکی ہو، یا اسی طرح کی کوئی دوسری غیر معمولی وجوہات۔

(۳) تمام ضبط شدہ زرعی زمینوں کو نہایت آسان شرائط و اقساط پر ایسے کسانوں اور کاشتکاروں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے جن کے پاس پہلے سے کوئی زمین موجود نہ ہو یا گزارے کی حد سے کم زمین ہو، اور جو خود ان زمینوں پر کاشت کریں اور خود کفیل بن جائیں۔

(۴) مزارعت کے متعلق موجودہ حالات و قوانین پر مکمل نظرِ ثانی کی جائے تاکہ ان کو شریعت کے مطابق منصفانہ بنایا جائے۔ اس طرح زمینداری کے ظلم و ستم اور فتنہ و فساد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جائے۔ پھر زرعی مزدوروں کے بھی شرائطِ ملازمت، کام کے طریقے و ماحول اور اوقاتِ کار کی پوری طرح اصلاح کی جائے۔

(۵) امداد باہمی کی بنیاد پر تنظیم بنانے والے کم حیثیت افراد کی عملاً ہمت افزائی کی جائے۔ جو غیر مملوکہ زمین بنجر پڑی ہوئی ہو اس کو امداد باہمی کی انجمنوں کے ذریعہ قابلِ کاشت بنایا جائے۔

(۶) ملکی خوراک کی پیداوار میں کمی کے بہانے جو ناجائز و غیر اسلامی ضبطِ ولادت کی اسکیم جاری ہے اس کو یکسر ختم کر کے متبادل صورت اختیار کی جائے، یعنی کہ ضبطِ ولادت کی اسکیم پر خرچ ہونے والے کروڑوں روپے زرعی پیداوار بڑھانے کی گوناگوں اسکیموں پر صرف کیے جائیں۔ اس کے لیے کاشت و زراعت کے جدید طریقے اور تکنیک سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ٹریکٹر، دیگر آلات و اوزار اور کھاد وغیرہ کا معقول انتظام کیا جائے، آبپاشی کے نظام کو بہتر بنایا جائے، سیم و تھور کا سدِباب کیا جائے۔ اور فصل کو کیڑے مکوڑوں اور دوسری خرابیوں سے محفوظ رکھا جائے۔ اس طرح زرعی پیدآوری میں اضافہ اس حد تک کیا جائے کہ ملک نہ صرف یہ کہ خوراک میں خود کفیل بن جائے بلکہ وہ برآمدات کے ذریعہ زرِ مبادلہ بھی کما سکے۔

(۷) آئندہ جن نئی زمینوں کو حکومت بیراجوں کے ذریعے قابلِ کاشت بنائے، ان کو نہ تو نیلام کے ذریعہ فروخت کیا جائے اور نہ وہ سرکاری ملازمین اور با اثر افراد کو بطورِ عطیات بخش دی جائیں۔ ایسی تمام زمینوں کو آسان شرائط و اقساط پر عوام کے ہاتھ فروخت کر دینا چاہیے۔ اولیت ان کاشت کاروں کو دی جائے جن کے پاس اپنی کوئی زرعی زمین نہ ہو۔ اگر زمین پھر بھی بچ رہے تو ترجیح ان مالکانِ زمین کو دینا چاہیے جن کے پاس اقتصادی حد سے کم زمین پائی جائے۔ تیسرے درجہ پر ان افراد کو رکھا جائے جو پیشہ ور کاشت کار نہ ہونے کے باوجود کاشت کاری کو اپنا ذریعۂ معاش بنانا چاہتے ہوں۔ شعبۂ زراعت کے لیے یہ وہ آخری تجویز ہے جس کے ساتھ میدانِ زراعت میں آئے دن ہونے والے استحصالی کھیلوں کے امکانات تقریباً ختم ہو جاتے ہیں۔

(ب) شعبۂ صنعت و تجارت

(۱) ان تمام صنعت کاروں اور تاجروں کی دولت کا باقاعدہ احتساب کیا جائے جن کے پاس غیر معمولی نوعیت کا ارتکازِ دولت پایا جاتا ہے۔ ثبوت فراہم ہونے پر ان لوگوں سے وہ سب کچھ لے لیا جائے جو حرام و ناجائز ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو۔ اس طرح کی واپس لی ہوئی دولت کو سرکاری خزانہ/بیت المال میں جمع کر دینا چاہیے۔ بلاشبہ ایسی دولت کا بہترین مصرف کفالتِ عامہ ہی ہو سکتا ہے۔

(۲) صنعت و تجارت میں چند لوگوں کی ناجائز قائم کردہ اجارہ داریاں ختم کی جائیں اس لیے کہ

اجارہ داریوں کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ اشیاء کی مصنوعی قیمتیں مقرر کی جاتی ہیں بلکہ عوام کی کمر توڑ کر بے پناہ نفع سمیٹ لیا جاتا ہے۔ اس طرح کی من مانی حرکات کو روکنے کے لیے قوانین وضع کرنے کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کو امداد باہمی اور شراکت کی بنیاد پر صنعت و تجارت کے میدان میں داخل ہونے کی ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جائے۔ یہ وہ طریق کار ہے جس کی بدولت صنعت و تجارت میں جائز مسابقت فروغ پا سکے گی اور اجارہ داریاں آپ سے آپ مٹتی چلی جائیں گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کی معاشی ترقی کا فائدہ چند جیبوں میں جانے کے بجائے معاشرہ کے ایک ایک فرد تک پہنچ جائے گا۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر گھریلو صنعتوں کی عملاً ہمت افزائی کی جانی چاہیے اور اس میدان میں نئے افراد کا خیر مقدم ہونا چاہیے۔

(۳) معتدل و آزاد معیشت کے لیے شراکت کی بنیاد پر نئی کمپنیوں کی تشکیل کے بارے میں یہ تحدید کی جا سکتی ہے کہ کسی بھی ایک خاندان سے کمپنی کے مؤسسین میں سے ایک تہائی سے زیادہ افراد اس کے ڈائرکٹر نہیں بن سکتے۔ کمپنی کے بقیہ ڈائرکٹر عام حصص یافتگان میں سے لیے جائیں۔ اس طریق کار سے نئے صنعتی و تجارتی اداروں میں صرف چند لوگوں کا تسلط قائم نہ ہو سکے گا بلکہ ان کی ملکیت معاشرہ کے زیادہ سے زیادہ افراد حاصل کر سکیں گے۔ بالفاظ دیگر ایسے نئے اداروں کے منافع میں عوام کی کثیر تعداد حصہ وار بنتی رہے گی۔ کمپنی کے قیام کے بعد بھی ڈائرکٹران کے آئندہ انتخابات پر ہر سال ایک تہائی کی قید برقرار رہے۔ اس معقول پابندی کے ساتھ ساتھ مینجنگ ایجنسیوں کے ہاتھوں عوامی سرمایہ کی موجودہ لوٹ کھسوٹ کے پیشِ نظر ملک میں مینجنگ ایجنسی سسٹم کو بالکلیہ ختم کر دیا جائے۔

(۴) موجودہ دور میں کمپنیوں کے حصص کی عام خرید و فروخت میں ایک بہت بڑی خرابی پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ کوئی بھی ایک فرد یا ایک خاندان جب چاہے کسی بھی کمپنی کے قابلِ فروخت تمام حصص اسٹاک ایکسچینج کے ذریعہ خرید سکتا ہے۔ اس عمل سے ایک طرف تو کسی بھی کمپنی کے سرمایہ کا بڑا حصہ شخصِ واحد کے کنٹرول میں آجاتا ہے اور دوسری طرف کمپنی کے حصص کی مصنوعی قلت پیدا کر کے اس کی قیمتوں میں زبردستی اضافہ پیدا کر دیا جاتا ہے۔ پھر جب حصص کی قیمت بڑھ جاتی ہے تو وہ شخص جو مارکیٹ سے تمام حصص سمیٹ کر لے گیا تھا انہیں فروخت کرنا شروع کر دیتا ہے اور اندھا دھند

منافع کماتا ہے۔ اگر پورے اسٹاک ایکسچینج کے کام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ بعض مخصوص لوگ مستقلاً سرمایہ پر کنٹرول اور مصنوعی ذریعہ سے نفع اندوزی میں ماہر بن چکے ہیں۔ حصص کی خرید و فروخت کی اس قباحت کے پیش نظر یہ قانون بنایا جا سکتا ہے کہ مشترک کفالت کا ایک خاندان کسی بھی کمپنی کے حصص ایک خاص حد سے زیادہ حاصل نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر یہ حد کمپنی کے کل سرمایہ کی پانچ فیصدی ہو سکتی ہے۔

(۵) بڑے بڑے صنعتکار اور تاجر تجارتی بنکوں کے ڈائرکٹر بن کر بنک سے بڑے بڑے قرضے ناجائز طریقوں سے حاصل کرتے ہیں۔ اس خرابی کا سدباب کرنے کے لیے یہ پابندی عائد کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ بنک کے وہ ڈائرکٹر صاحبان جو دوسرے صنعتی اداروں میں بھی ڈائرکٹر ہیں، آئندہ سے بنک کے ڈائرکٹر نہیں رہ سکتے۔ اس کے لیے وہ اپنے بنک کے حصص دوسروں کے ہاتھ فروخت کر کے سبکدوش ہو جائیں۔ اس طرح میدانِ صنعت و تجارت میں سرمایہ کاری اور بنکاری کا جو ناجائز گٹھ جوڑ پایا جاتا ہے وہ بہ آسانی دُور کیا جا سکتا ہے۔ تاہم کوئی فرد بنک کا ڈائرکٹر نہ ہوتے ہوئے دوسری کئی کمپنیوں کا ڈائرکٹر بن سکتا ہے۔

(۶) صنعتکاروں اور تاجروں کے لیے قرضوں کی میعاد اور زیادہ سے زیادہ رقم کی حد بھی مقرر کی جا سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ کوئی شخص یا خاندان ایک سال میں پانچ لاکھ یا دس لاکھ روپے سے زیادہ تجارتی بنک سے قرضہ حاصل نہ کرے۔ اس قسم کی شرط رکھنے سے چھوٹے صنعتکاروں اور تاجروں کو فائدہ پہنچ سکے گا اور بنک کے کریڈٹ ذرائع صرف چند بڑے بڑے کارخانوں یا اداروں تک ہی محدود نہ ہونے پائیں گے۔ چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے استحکام کے لیے اس قسم کی مالی اعانت بے انتہا ضروری بھی ہے اور مفید بھی۔

(۷) اسلامی شریعت کے مطابق تمام حرام و ناجائز اشیاء کی صنعت اور تجارت کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ صنعت و تجارت میں جو طریقے شریعت کی رُو سے حرام اور ناجائز ہیں ان پر بھی قانونی پابندی لگا دی جاتی ہے۔ شعبۂ صنعت و تجارت سے متعلق اس آخری مجوزہ تدبیر

کے ذریعہ موجودہ دردناک معاشی حالات کا علاج تکمیل پذیر ہو جائے گا تا آنکہ میدانِ صنعت و تجارت معاشی ظلم و ستم سے پاک ہو جائے۔

(ج) شعبۂ محنت

(۱) محنت کاروں کی پانچ قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ سرکاری، زرعی، صنعتی، تجارتی اور نجی۔ اسی طرح تمام محنت کاروں کے مسائل بھی پانچ حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں یعنی نوعیتِ ملازمت (عارضی، آزمائشی، میعادی یا مستقل)، اوقاتِ کار، حالاتِ کار، اُجرت اور معاشرتی ضمانت۔ ان بنیادی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے سب سے پہلے مروجہ ناقص قوانینِ محنت پر ازسرِ نو نظرِ ثانی کی جانی چاہیے تاکہ اس میں تمام پہلو سما سکیں۔ مثال کے طور پر موجودہ قوانین میں نجی ملازمین کی عظیم تعداد کو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کا مداوا بہت ضروری ہے تاکہ نجی ملازمین کو بھی قانونی تحفظ حاصل ہو سکے۔

(۲) نوعیتِ ملازمت معقول اور منصفانہ ہونی چاہیے۔ مثال کے طور پر ملازمت کی آزمائشی مدت غیر ضروری طور پر طویل نہیں ہونی چاہیے۔ عام حالات میں یہ مدت تین ماہ کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔ اوقاتِ کار اور حالاتِ کار ایسے ہونے چاہییں کہ مزدور و ملازم اپنی صحت کو برقرار رکھ سکے۔ پھر یہ کہ اس کو اتنی فرصت بھی دستیاب ہو کہ وہ اپنی ذاتی، خاندانی اور سماجی ضروریات کو بھی پورا کرنے کے قابل رہے۔ اُجرت کے سلسلہ میں سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اُجرت یا معاوضہ کی کم سے کم حد مقرر کر دی جائے۔ اُجرت کی یہ حد ایسی ہونی چاہیے کہ ایک اوسط گھرانے کی بنیادی ضروریات یعنی غذا، لباس، رہائش، علاج اور تعلیم پوری ہو سکیں۔ مثال کے طور پر موجودہ دور میں یہ حد دو سو روپے ہو سکتی ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے لحاظ سے کم سے کم حدِ اجرت میں بھی گاہے گاہے ترمیم کی جاتی رہنی چاہیے۔ معاشرتی ضمانت کے تحت ہر شخص کو بنیادی تحفظات دینے چاہییں۔ مثال کے طور پر اگر ڈیوٹی کے دوران کوئی حادثہ ہو جاتے اور اس کی جان چلی جائے تو اس کے کنبے کو اس کی مالی تلافی ادا کر دی جائے۔ اسی طرح پیشہ ورانہ امراض یا جسمانی اعضاء کے مجروح ہونے پر علاج و تلافی کا انتظام ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ بڑھاپے کے لیے مناسب پنشن اسکیم بھی رائج کی جائے جو پراویڈنٹ فنڈ اسکیم کے ساتھ ساتھ

نافذ العمل رہے۔

(۳) محنت کاروں کے اندر اپنے کام میں بھرپور دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ایک قانونِ ترغیبات بھی بنایا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جس دولت کے پیدا کرنے میں ان کی محنت شامل ہے اس کے منافع میں بھی ان کو ایک حصہ مل جائے۔ مثلاً نفع آور اداروں کے منافع کا ڈھائی فیصد حصہ اس کے ملازمین کے لیے بطور بونس مخصوص کیا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مظاہروں اور کارناموں پر متعلقہ افراد کو انعامات سے نوازا جائے۔

(۴) اس بات کا بھی معقول انتظام کیا جانا چاہیے کہ ملازمتوں میں بے جا اقربا پروری نہ کی جا سکے۔ اگر کارخانوں اور دیگر اداروں میں ٹکنیکی آسامیاں ہوں تو اس کے لیے سند یافتہ یا تربیت یافتہ افراد ہی لیے جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ایسی مخصوص آسامیوں پر نااہل اعزا و اقربا کا تقرر کر دیا جائے۔ حالانکہ اس فن کے ماہرین بڑی تعداد میں موجود ہوں۔ حکومت کو اس قسم کی تمام نارَوا کارروائیوں کی روک تھام کے لیے قانون سازی کے علاوہ سارے اداروں کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھنی چاہیے۔

(۵) قابلِ محنت بے روزگار افراد کو روزی کمانے کی خاطر حکومت کا شعبۂ محنت ضروری معلومات، مختلف اعداد و شمار اور نئے مواقع فراہم کرنے کی تفصیلی اسکیم بنائے تاکہ بے روزگار اپنی محنت و مشقت سے باعزت زندگی بسر کر سکیں اور بلا وجہ حکومت کی کفالت کے محتاج نہ ہونے پائیں۔ اس اہم کام کے لیے موجودہ دفاترِ روزگار کی تحقیقی اور عملی نقطۂ نگاہ سے مکمل اصلاح کر کے مطلوبہ مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں اور مسئلۂ بیروزگاری پر بڑی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔

(۶) یہ عجیب بات ہے کہ عصرِ حاضر میں سرمایہ اور محنت کا چولی دامن کا ساتھ ہونے کے باوجود دونوں میں سخت کشمکش پائی جاتی ہے حالانکہ اس کشمکش میں دونوں کا صریح خسارہ ہی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر معاملات میں ایک دوسرے کا تعاون پیدا ہو جائے تو فریقین کو فائدہ ہی فائدہ حاصل ہوگا۔ اس بنیادی حقیقت کی بڑی مؤثر تشہیر اور تلقین کی جانی چاہیے۔ علاوہ ازیں اس بات کا بھی اہتمام کیا جائے کہ حکومت کی دعوت پر مختلف مستاجروں اور اجیروں کے نمائندوں کے مشترکہ سالانہ اجلاس ہوتے رہیں تاکہ دونوں فریق اسی جذبۂ تعاون کے ساتھ اور اپنے نفع کی خاطر ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھیں اور کوئی متفقہ

لائحہ عمل بنلاتے رہیں۔ سرمایہ و محنت میں تصادم کے بجائے تعاون پیدا کرنے کی خاطر اور محنت کاروں کی نمائندگی کے لیے ٹریڈ یونین کے قیام کی اجازت ہونی چاہیے۔

(۷) شعبۂ محنت سے متعلق ساتویں اور آخری تجویز یہ ہے کہ تمام منصفانہ قوانین کو بنانے اور نافذ کرنے کے بعد جو بھی محنت اور سرمایہ کے اختلافات و نزاعات پیدا ہوں ان کے تصفیہ کے لیے ایک ایسی با اختیار مشنری قائم کی جائے جو حقداروں کو ان کے جائز حقوق پورے عدل کے ساتھ اور بہ آسانی و بروقت دلوا سکے۔ ایسی مشینری کی اوّلین ذمہ داری یہ ہونی چاہیے کہ وہ کسی فرد پر بھی ظلم کا ایک لمحہ بھی برداشت نہ کرے اور بغیر کسی خوف اور لالچ کے لوگوں کو انصاف پر قائم رہنے کے لیے مجبور کر دے۔ جب تمام محنت کاروں کو ان کا جائز حق مل جائے گا اور ان کے ساتھ پورا پورا انصاف برتا جائے گا تو یقیناً ان مطمئن افراد کی کارکردگی میں اضافہ ہوگا جس کے نتیجہ میں قومی پیداوار بڑھے گی اور مصارفِ پیداوار کم ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورتِ حال میں افراطِ زر جیسا پریشان کن اور پیچیدہ مسئلہ معیشت میں پیدا نہ ہو سکے گا۔

(د) شعبۂ مالیاتِ عامہ، کفالتِ عامہ و رفاہِ عامہ

(۱) اس اہم شعبہ کا اوّلین فریضہ یہ ہوگا کہ ملک کی مالیاتی آمدنی کے لیے بیت المال کا نظامِ زکوٰۃ، صدقات، نفقات و محصولات قائم کر دیا جائے۔ ساتھ ہی شریعت کو مقرر کردہ مالی سزاؤں کو بھی نافذ کر دیا جائے۔ ان تمام متنوع مداتِ آمدنی کی تفصیل اس سے قبل دی جا چکی ہے۔ یہاں صرف اتنا سمجھنا کافی ہے کہ ضرائب ہنگامی اور وقتی محصول، صرف اس وقت عائد کیا جائے گا جب دوسری شرعی مداتِ آمدنی اجتماعی ضروریات کو پورا نہ کر سکیں اور معاشی ترقی کے لیے مزید رقوم درکار ہوں۔ ضرائب کا اطلاق بھی اس طرح ہونا چاہیے کہ اس کا بیشتر بار دولتمند افراد پر پڑے۔ موجودہ فنّی معاشی مسائل کے پیشِ نظر ایک اور ذریعۂ آمدنی پر بھی زیادہ سے زیادہ توجہ دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ بین الاقوامی معاملات، تجارت اور لین دین کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ زرِ مبادلہ حاصل کرنے کا اہتمام کیا جائے اگر بہ نظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ اسلامی حکومت کا مجموعی مالیاتی نظام

اور ذرائع آمدنی کا ڈھانچہ ہی کچھ اس طرح کا ہے کہ وہ خود بخود معاشرہ میں افراطِ زر کو روکنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ اس ایک بنیادی خوبی کی وجہ سے ملک میں معاشی بے اعتدالیوں خصوصاً مہنگائی کی روک تھام بغیر کسی مصنوعی طریقِ کار کے ہو جائے گی۔

(۲) ایسے تمام ناداروں، محتاجوں، معذوروں، بیواؤں، یتامیٰ، بے روزگاروں اور دوسرے ضرورت مندوں کی تفصیلی فہرست بلا تاخیر تیار کی جائے جن کا کوئی کفیل موجود نہ ہو تاکہ ان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی اور کفالت کے لیے وظائف کا باقاعدہ انتظام کیا جا سکے۔ یہ اہم کام ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد سال بہ سال ہی نہیں بلکہ ہر روز مسلسل ہوتے رہنا چاہیے۔ اس طرح وظائف پانے والے افراد کی فہرست میں کسی وقت کمی بھی ہو سکتی ہے اور اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ مالیاتِ عامہ کے شعبہ کو کفالتِ کا کام ہر صورت میں انجام دینا چاہیے۔ کفالتِ عامہ کی تنظیم کے ساتھ ساتھ رفاہِ عامہ کے کاموں کا نظم و نسق نہ صرف یہ کہ برقرار رہے گا بلکہ اس کے دائرۂ کار کو مزید وسیع اور بہتر بنانا چاہیے۔

(۳) ملکی معیشت سے سُود کو جو کہ معاشی فساد و استحصال کی جڑ ہے سرے سے بے دخل کر دیا جائے۔ سُود کو دو مرحلوں میں ختم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے مرحلہ میں اندرونِ ملک ممنوع کر دیا جائے اور دوسرے مرحلہ میں بین الاقوامی لین دین کو کم سے کم اس لعنت سے نجات حاصل کی جائے۔ بلاشبہ عبوری دور میں بین الاقوامی معاہدات کی پابندی کرنے کے لیے سُود کو اضطراراً برداشت کرنا ہوگا۔ البتہ اس بات کی لگاتار کوشش ضرور ہونی چاہیے کہ ملک کی بیشتر ضروریات اندرونِ ملک کے وسائل سے ہی پوری ہو جائیں۔ اس کے باوجود اگر کسی بیرونی مدد کی حاجت ہو تو اس کو مبادلۂ جنس کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ بین الاقوامی سطح پر سُود کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہونے پائے۔ سُود سے بچنے کے لیے یہ شکل قطعی قابلِ عمل ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ شعبۂ مالیات کے کارکنان دن رات محنت کرتے رہیں اور متبادل صورتیں حتی الامکان اختیار کرتے رہیں۔ اس سلسلہ میں سود ختم کرنے کے لیے جو بھی طویل المیعاد منصوبہ بنایا جائے گا اس کے اختتام تک غیر سُودی معیشت کی افادیت دوسرے ممالک بھی دیکھ چکے ہوں گے اور اس لیے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مستقبل میں وہ تمام ممالک اپنے تجارتی

تعلقات برقرار رکھنے کے لیے سودی معاملات سے دست بردار ہو جائیں گے۔ سود ختم کرنے کا ایک اور عظیم فائدہ بھی حاصل ہوگا اور وہ یہ کہ عوامی دولت میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔ یہ اس طرح کہ حکومت زرِمبادلہ کے قرضہ جات کو اصول مضاربت (شرکتِ منافع) پر ملک کے صنعتکاروں اور تاجروں کو دے گی جس سے بہت بڑی مقدار میں منافع قومی خزانہ میں جمع ہوتا رہے گا کون نہیں جانتا کہ اِس صنعتی دور میں زرِمبادلہ کے بغیر چارہ کار نہیں۔ یہ سب زرِمبادلہ کا ہی کرشمہ ہے کہ آجکل کے صنعتی ادارے دیکھتے ہی دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچ گئے اور کتنے عظیم الشان پیمانہ پر منافع کما رہے ہیں۔ چونکہ زرِمبادلہ قومی دولت ہے اس لیے اس سے استعمال شدہ منافع پر بھی قوم کا حق ہے۔ اصول مضاربت پر زرِمبادلہ کی سرمایہ کاری قرضداروں کا نقصان کیے بغیر ملت کو اس کا جائز حق دلوا سکتی ہے۔ اہل صنعت و تجارت حسب معمول منافع کماتے رہیں گے۔ فرق صرف اتنا پڑے گا کہ وہ آئندہ سود کی معمولی مقررہ رقم ادا کرنے کے بجائے اپنے غیر معمولی منافع کا ایک حصہ قوم کو واپس لوٹاتے رہیں گے

(۴) مرکزی بنک نہ صرف یہ کہ سود کی برائیوں سے پاک کیا جائے بلکہ اس کی تمام پالیسیوں اور اسکیموں میں بھی اسی مناسبت سے مؤثر ترامیم کی جائیں، خواہ وہ کریڈٹ پالیسی ہو یا مالی پالیسی، توازنِ ادائگی کی اسکیم ہو یا زرمبادلہ کا کنٹرول، سونے کے ذخائر کا حصول ہو یا نوٹوں کے چھاپنے کا انتظام! ورگردشِ زر کا مسئلہ ہو یا افراطِ زر کا۔ مرکزی بنک کے پورے نظام العمل کا واحد مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ سود کی تباہ کاریوں کا آہستہ آہستہ مداوا کرے اور ملک میں اقتصادی خوشحالی کو زیادہ سے زیادہ عام کرے اس سلسلہ میں مرکزی بنک کے موجودہ محکمۂ تحقیق و تفتیش کی ذمہ داریاں کئی گنی بڑھ جائیں گی لہذا اس کے لیے ملک کے بہترین دماغ اور ماہرین کا بھرپور عملی تعاون حاصل کیا جانا چاہیے۔ ضرورت پڑنے پر مرکزی بنک کے دوسرے محکموں میں بھی مناسب و معقول ردّوبدل کیا جاسکتا ہے۔ مختصراً یہ کہ مرکزی بنک کے نظام کی از سرِ نو ترتیب و تنظیم کا کام اوّل روز سے شروع کر دینا چاہیے۔

(۵) ملک کے تمام بنکوں اور سرمایہ کاری کے موجودہ اداروں کو بھی قائم رکھتے ہوئے اصول

مضاربت پر منظم کرایا جائے اور اس کی پابندی مناسب موقع پر غیر ملکی بینکوں سے بھی کرائی جائے۔ اصولِ مضاربت پر بنکاری کی تنظیم نو کی وجہ سے ملک کے اندر سرمایہ کاری میں خاطر خواہ اضافہ ہونا یقینی ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ پہلی یہ کہ جن افراد کے پاس اپنی پس انداز کی ہوئی دولت ہوگی وہ اس پر سال بہ سال زکوٰۃ ادا کر کے اپنے سرمایہ کو مسلسل کم کرنے کے بجائے اس کو سرمایہ کاری کے ذریعہ برابر بڑھانے کو ترجیح دیں گے۔ یہ ایک نفسیاتی بات ہے کہ اگر آدمی کو اپنی جمع شدہ پونجی کا کوئی حصہ قانوناً حکومت کے حوالہ کرنا پڑے تو وہ اس مقررہ حصہ کی ادائیگی سے قبل اپنی کل پونجی سے مزید دولت کمانے کی کوشش کرے گا۔ یوں سرمایہ کاری کا ایک لامتناہی سلسلہ چلتا رہے گا۔ سرمایہ کاری میں اضافہ کی دوسری وجہ یہ ہوگی کہ جب معاشرہ کے تمام افراد کو یہ ضمانت مل جائے گی کہ ان کے بعد ان کے کنبوں کی کفالت کا خودکار انتظام اپنی بہترین شکل میں موجود ہے تو وہ سب لوگ فکرِ فردا سے بالکل بے نیاز ہو کر سرمایہ کاری کے لیے اپنا سارا پس انداز کیا ہوا اثاثہ زر لگا دیں گے۔ سرمایہ کاری میں اضافہ کا یہ وہ فطری طریقِ کار ہوگا جس کے باعث گوناگوں فوائد حاصل ہوں گے۔ اوّل یہ کہ روزگار میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا جس سے بیروزگاری آپ سے آپ ختم ہو جائے گی۔ دوسرے یہ کہ مجموعی قومی پیداوار اور قومی دولت و آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ اور ملک بڑی حد تک خودکفیل بن جائے گا۔ تیسرے یہ کہ برآمدات خودبخود بڑھتی جائیں گی اور درآمدات کم سے کم سطح پہ آجائیں گی جس کے نتیجہ میں سب سے بڑا فائدہ زرمبادلہ میں اضافہ کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ ان تینوں سود مند عوامل کا بالآخر ماحصل یہ ہوگا کہ ملک کے عام باشندوں کی معاشی خوشحالی اور معیارِ زندگی میں بہت معقول ترقی ہوگی۔ یہ ہیں وہ عظیم فوائد جن کے لیے دنیا میں دوسرے نظام طرح طرح کے مصنوعی اور غیر فطری حربے استعمال کرتے ہیں مگر پھر بھی نتیجہ دردسری کے سوا کچھ بھی نہیں نکلتا۔ اس کے برعکس اسلامی نظامِ مالیات میں لوگوں کو یہ سارے فوائد آپ سے آپ حاصل ہوتے رہیں گے۔

(۶) انشورنس کے ملک گیر کاروبار کو بھی سود و قمار سے پاک کر کے امداد باہمی کی بنیاد پر منظم کیا جانا چاہیے۔ یہ اسکیم بھی انتہائی قابلِ عمل ہے، اس لیے کہ لوگ خود ہی باہمی اشتراک اور ایک طے شدہ تناسب سے اپنا مشترک فنڈ بہ آسانی قائم کر سکتے ہیں جو بوقتِ ضرورت ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنے

کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ کہ تجربات کی روشنی میں فنڈ کے ممبران کی ضروریات کا سال بہ سال تخمینہ لگایا جا سکتا ہے اور فنڈ کا زائد از ضرورت حصہ اصولِ مضاربت پر براہِ راست یا بنکوں کے ذریعہ صنعت و تجارت میں لگایا جا سکتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ امداد باہمی کا فنڈ ہمیشہ پھلتا پھولتا رہے گا اور اس کے ممبران کو مختلف سہولتیں میسّر ہوتی رہیں گی۔ اس مجوزہ اسکیم کے تحت دو اور ضمنی فوائد حاصل ہونگے۔ پہلا یہ کہ بڑے سرمایہ داروں کی موجودہ انشورنس کے ذریعہ لوٹ کھسوٹ سے عوام کو نجات مل سکے گی اور دوسرا یہ کہ حکومت کے نظام کفالتِ عامہ کا بوجھ کسی حد تک ہلکا ہو جائے گا۔ اس طرح حکومت اپنی بجٹ کی رقم کو کچھ نئے رفاہی کاموں پر صرف کرنے کے قابل ہو سکے گی۔ ظاہر ہے ان تمام مربوط عوامل کا اثر قومی و معاشی فلاح و بہبودی کی شکل میں نمودار ہوگا۔

(۷) شعبۂ مالیاتِ عامہ کے ضمن میں ساتویں اور آخری تجویز یہ ہے کہ اسلام کے معاشی نظام سے ہم آہنگ مشترکہ اور محدود اجتماعی ملکیت کا تدریجی قیام عمل میں لایا جائے۔ قومی انتظام میں چلائے جانے والے اداروں اور ان کے دائرۂ کار کی پوری تفصیل اس سے قبل بیان کی جا چکی ہے۔ یہاں صرف ایک عملی نکتہ پر زور دینا مقصود ہے اور وہ یہ کہ ملک کے تمام قدرتی ذخائر مثلاً تیل، گیس، لوہا، کوئلہ اور دیگر معدنیات و قیمتی ذخائر کی تلاش و دریافت کو ایک مستقل پلان کے تحت روزِ اول سے ہی تیز تر کر دیا جائے۔ اس سے نہ صرف قومی دولت میں بیش بہا اضافہ ہوگا بلکہ ملک معاشی ترقی کی بنیادی ضرورتوں کے لیے زیادہ عرصہ تک دوسروں کا دست نگر نہ رہ سکے گا۔ ایک وقت ایسا بھی آ سکتا ہے کہ ملک غیروں کی مدد کا محتاج ہونے کے بجائے اس قابل ہو جائے کہ وہ دوسرے پسماندہ ممالک کی عملاً مدد کر سکے اور بین الاقوامی سطح پر اپنا ایک مقام بنا لے۔

(ھ) شعبۂ رابطۂ معیشت

(۱) اس شعبہ کا اوّلین کام یہ ہونا چاہیے کہ معیشت کے دوسرے چار شعبوں (زراعت، صنعت و تجارت، محنت اور مالیاتِ عامہ) کے ساتھ مستقل ربط و تعلق استوار رکھے تاکہ معیشت کے پانچوں مجوزہ شعبوں میں ہم آہنگی پیدا ہو اور ان سب کی کارکردگی بحسن و خوبی انجام پا سکے۔ اس مقصد کے

لیے بہترین صورت یہ ہے کہ شعبۂ رابطہ کی انتظامیہ سے منسلک ایک رابطہ کونسل کی تشکیل کی جائے جس میں معیشت کے پانچوں شعبوں کے سرکاری نامزد افراد کے ساتھ مخصوص ماہرین فن بھی ہوں اور زمینداروں، صنعتکاروں، تاجروں، محنت کاروں اور صارفین کے نمایندے بھی ہوں۔ یہ مستقل مجلس مشاورت پارلیمنٹ کے مقرر کردہ مرکزی معاشی ادارے کے رہنما پروگرام کی روشنی میں ایک جامع منصوبہ ترتیب دے اور اس کی منظوری حاصل کرنے کے بعد میدانِ عمل کے مختلف مراحل اور اس کے نشیب و فراز سے نبرد آزما رہے۔ اس طرح رابطۂ معیشت کا عملِ مسلسل وقتی مسائل کو اپنی مضبوط گرفت میں رکھ سکے گا اور ملک کی پوری معیشت کو عدم استقرار سے محفوظ کرے گا۔ رابطہ کونسل کی یہ ذمہ داری بھی ہونی چاہیے کہ وہ اپنی سہ ماہی رپورٹیں تیار کر کے مرکزی معاشی اداروں کے روبرو پیش کرتی رہے۔

(۲) اسلامی ریاست کی وسیع ذمہ داریوں کے پیشِ نظر اجتماعی معاشی منصوبہ بندی ناگزیر ہے۔ کفالتِ عامہ، اقتصادی ترقی اور تقسیمِ دولت کے بے جا تفاوت کو کم کرنے کی معاشی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے علاوہ ایک اسلامی حکومت کو اپنے افراد کی اخلاقی تربیت، اقامتِ معروف، انسدادِ منکر، دفاعِ سرحدات اور دنیا کے سامنے دعوت الی الخیر کے لیے بھی اپنے آپ کو ہر آن مستعد و فعال رکھنا ہوگا۔ لہٰذا ان تمام اہم امور کی انجام دہی کے لیے وسیع ذرائع و وسائل کا اہتمام ایک سوچے سمجھے منصوبے کے بغیر ناممکن ہے۔ اجتماعی معاشی منصوبہ بندی کے حسبِ ذیل پانچ مقاصد مقرر کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ پیداواری ذرائع و وسائل سے بھرپور استفادہ۔

۲۔ قومی پیداوار اور قومی آمدنی میں اضافہ۔

۳۔ قومی ضروریات اور قومی پیداوار میں مطابقت۔

۴۔ مکمل روزگار کا حصول اور معیارِ زندگی میں اضافہ۔

۵۔ تلاطمِ معیشت یا معاشی اتار چڑھاؤ کے بغیر تیز رفتار معاشی ترقی۔

مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے معاشی منصوبہ بندی کی تفصیلی درجہ بندی حسبِ ذیل پانچ طرح ہو

سے کی جانی چاہیے :

۱۔ نظامِ ترجیحات کا قیام ۔

۲۔ ترقیاتی پروگراموں کے لیے مختلف اہداف کا تعین ۔

۳۔ لاگت اور مصارف کا حقیقت پسندانہ تخمینہ ۔

۴۔ مالیاتی وسائل کا معقول انتظام ۔

۵۔ مصارف و مالیات کا تطابق و توازن ۔

اجتماعی معاشی منصوبہ بنانے کے بعد اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہر سال تین چیزوں کا تعین بہت ضروری ہے۔ اول یہ کہ رفتارِ کار کا مکمل جائزہ لیا جائے ۔ دوسرے یہ کہ ملکی بجٹ کا تفصیلی خاکہ مرتب کیا جائے اور تیسرے یہ کہ درآمد و برآمد کی پالیسی بنائی جائے ۔ سالانہ بجٹ کو معاشی منصوبے اور اس کے نکاتِ جائزہ کا عکاس ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں اتنا اشارہ کافی ہے کہ سالانہ بجٹ میں آمد و خرچ اور طلب و رسد کا توازن اس طرح قائم کیا جائے کہ افراطِ زر یا کساد بازاری کی نوبت نہ آنے پائے اور معیشت غیر معمولی اتار چڑھاؤ کی شکار نہ ہو سکے۔ درآمد و برآمد کی پالیسی اس طرح وضع کی جائے کہ برآمدات بڑھیں اور درآمدات گھٹیں۔ اس کے لیے درآمد ہونے والی اشیائے تعیش قطعی ممنوع قرار دی جا سکتی ہیں۔ اور ضروری اشیائے درآمد کو کم سے کم کرنے کے لیے قومی پیداوار سے متبادل صورتیں اختیار کی جائیں۔ بیرونی توازنِ ادائیگی ایسا ہونا چاہیے کہ زرِ مبادلہ میں سال بہ سال اضافہ ہوتا رہے۔ درآمد و برآمد کی مجوزہ پالیسی میں گھریلو صنعتیں بڑا اہم کردار ادا کر سکتی ہیں لہٰذا ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس سلسلہ کی آخری بات یہ ہے کہ غیر ملکی نام نہاد ماہرینِ فن کی درآمد پر بھی سختی کے ساتھ کنٹرول کیا جانا چاہیے ۔

(۳) معاشی منصوبہ بندی کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ معیشت کے ہر ہر پہلو پر بالکل صحیح اور قابلِ اعتبار اعداد و شمار مہیا کیے جائیں۔ اس بنیادی کام کے لیے موجودہ مرکزی محکمہ شماریات کے طریقِ کار پر نظرِ ثانی کر کے اس کو بڑے پیمانہ پر ٹھیک ٹھیک منظم کیا جائے تاکہ مطلوبہ مقاصد حاصل ہو جائیں۔ کوشش اس بات کی ہونی چاہیے کہ تشکیلِ جدید کے بعد تمام اعداد و شمار کا دار و مدار ظن و تخمینہ پر ہرگز نہ ہو بلکہ وہ صرف حقائق پر مبنی ہوں ۔

(۴) شعبہ رابطہ معیشت کا چوتھا اہم کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ معیشت کے ہر پہلو سے متعلق پارلیمنٹ اور حکومت کے طے کردہ تمام قوانین کو انتہائی جزئیات و تفصیلات کے ساتھ باقاعدہ مدون کرے اور ان قوانینِ معیشت کی نہایت مؤثر

تشہیر کا انتظام کرے تاکہ باشندگانِ ملک میں سے کوئی بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کسی بھی موقع پر نہ کر سکے۔ اس طرح حکومت اور عوام دونوں ہی ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہوئے ان قوانین کی پاسداری و پابندی کرنے کے قابل ہوں گے۔ قوانین و ضوابط کی کسی بھی شق پر اختلافِ رائے پیدا ہونے کی صورت میں معاملہ عدالت کے سپرد کر دیا جائے جس کا فیصلہ حتمی قرار پائیگا۔

(۵) شعبہ رابطہ معیشت کا پانچواں اور آخری مگر سب سے اہم فریضہ یہ ہوگا کہ وہ ملت کی معاشی فلاح و بہبود کے سرعتِ حصول کے لیے منظم پیمانہ پر ہمہ جہتی و ہمہ گیر تحقیق و تفتیش اور ایجادات و انکشافات کا بندوبست کرے۔ مختلف و متنوع ادارے قائم کرے اور ملک کے بہترین دماغ اور باصلاحیت افراد کو جمع کر کے تخلیقی قوتوں کو بھرپور طریقے سے بروئے کار لایا جائے۔ اس طریقِ کار سے ملک و قوم کے سارے ذرائع و وسائل سے پورا پورا استفادہ کیا جا سکے گا۔ طول بیانی سے بچنے کی خاطر یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں لاتعداد خودرو جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں جن پر ریسرچ اور استعمال کا معقول انتظام نہ ہونے کے باعث قوم کو دو بڑے نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ اوّلاً یہ کہ باصلاحیت اہلِ تحقیق کی تخلیقی قوتیں بالکل ضائع چلی جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ نباتاتی قومی دولت نہ صرف یہ کہ برباد ہوتی رہتی ہے بلکہ ملک کو الٹا انہی جڑی بوٹیوں سے بنی ہوئی دوائیں وغیرہ باہر سے منگا کر اپنا قیمتی زرمبادلہ صرف کر دینا پڑتا ہے۔ قومی نقصانات کی ایسی بیشمار مثالیں آئے دن سامنے آتی رہتی ہیں جن کا مداوا ازحد ضروری ہے۔ ان حالات میں یہ لازم ہے کہ ملک کی افرادی طاقت اور مادی وسائل کو ضائع ہونے سے بچایا جائے۔ اس مقصد کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں کہ محققین اور موجدین کی ایک پوری فوج کھڑی کر دی جائے تاکہ فلاحِ ملت کا عظیم کام تکمیل پذیر ہو جائے۔

اسلام کے معاشی نظام کے ابتدائی عملی نفاذ کے لیے یہ ہیں وہ شعبہ وار ۳۲ اجمالی نکات اور مجوزہ تدابیر جن میں وجوہِ غور و فکر ہے اور یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر ان نکات پر معیشت کی تعمیرِ نو کا آغاز کیا جائے تو تاریخ رفتہ رفتہ ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو دہرائیگی۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ ملک میں دولتمند افراد تو ان گنت ہونگے لیکن مستحقِ زکوٰۃ تلاشِ بسیار کے باوجود کوئی ایک بھی نہ مل سکے گا۔ کاش کہ اہلِ وطن کسی "ازم" کے بھکاری بننے کی بجائے اپنے گدڑی کے لعل کو پہچان جائیں۔ یہ گزارشات اسی جذبہ و مقصد کے ساتھ قارئین کرام کی خدمت میں نذر کی گئی ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

خواتین اور بچوّں کیلئے

آسان زبان میں اسلامی تعلیمات

۱۔ دین کی باتیں	محمد عبدالحی	اعلیٰ ایڈیشن	-/۴	روپے
	"	سستا ایڈیشن	-/۲	"
۲۔ اسلام کی تعلیم	"	اعلیٰ ایڈیشن	۱/۹۰	"
۳۔ ایمان کی اہمیت	"	"	-/۲	"
۴۔ دین کی خدمت	"	"	۲/۲۵	"
۵۔ دین کی حفاظت	"	"	۱/۳۰	"
۶۔ تبلیغ کی حکمت	"	"	-/۱	"

آپ کے گھروں کو اسلامی معاشرت میں ڈھالنے کیلئے بہترین کُتب

اِسلامک پبلکیشنز لمیٹڈ

۱۳۔ ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

شاخ ۷۔۱۶۰، بیت المکرم (پہلی منزل)، ڈھاکہ

اسلام کے معاشرتی نظام کی مفصّل اسکیم

اور اس کے قوانین و احکام کی

حکمت و دانش سمجھنے کے لیے چند بلند پایہ کُتب

پردہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

پردہ کی اہمیت، ضرورت اور اسلام کے احکام کی برتری پر نہایت مدلّل اور دلچسپ کتاب۔

اِسلامی معاشرہ کا مفصل نقشہ

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۷/- روپے

سستا ایڈیشن ۳/۷۵ روپے

حقوق الزوجین

سید ابو الاعلیٰ مودودی

اِسلام کے عائلی قوانین کی مدلّل تشریح

قانون و معاشرت پر

مستند کِتاب

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۴/- روپے

سستا ایڈیشن ۲/۲۵ روپے

عورت اِسلامی معاشرہ میں

سید جلال الدین انصر عمری

پُرسکون اور اسلامی احکام کے مطابق عائلی زندگی بسر کرنے کا

مفصّل دستور

سوسائٹی میں عورت کا صحیح مقام پہچاننے کے لیے ایک

بلند مرتبہ کِتاب ہے

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۷/- روپے

سستا ایڈیشن ۳/۷۵ روپے

اِسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳-ای، شاہ عالم مارکٹ، لاہور

۱۶-بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ